Regd. L. No. 7243

Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1968

سچے موتی

بتقریب جشن نزولِ قرآن

حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خبردار فتنہ واقع ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! اس سے کس طرح نجات ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے جس میں تمہارے درمیان (حرام و حلال یا طاعت و گناہ) کا حکم ہے اور حق و باطل کے اندر قول فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا، ہلاک کرے گا اس کو اللہ اور جس نے قرآن کے سوا کسی دوسری چیز میں ہدایت طلب کی، گمراہ کرے گا اس کو اللہ۔ جس نے قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا، اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔

(مشکوۃ۔ بحوالہ ترمذی۔ دارمی)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

ادارۂ طلوع اسلام کی انقلاب آفرین پیشکش

سلسبیل

قرآنی فکر کا چشمۂ رواں - قرآنی بصیرت کی جوئے شیر

یعنی

مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے انقلاب انگیز مضامین کا دوسرا مجموعہ

قرآن کریم کی حیات بخش تعلیم - پرویز کا حسین اندازِ بیان - اور

ادارہ کی پیشکش ——— تینوں یکجا -

کتابت، طباعت دیدہ زیب - کاغذ وھائٹ پرنٹنگ - جلد عمدہ - گردپوش جاذبِ نگاہ -

ضخامت - - ساڑھے تین سو صفحات

قیمت ——— مجلد آٹھ روپے

ادارۂ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون
سالانہ ـــ پاکستان ـــ دس روپے سالانہ ـــ ہندوستان ـــ پندرہ روپے سالانہ ـــ غیر ممالک ـــ ایک پونڈ	پاکستان ایک روپیہ ✱ ہندوستان ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

جلد (۲۱) فروری ۱۹۶۸ء شمارہ (۲)

فہرست

۱۔ لمعات ـــ (مسئلہ کشمیر) ـــ ۲

۲۔ ایک سہانی و نورانی تقریب ـــ ۶

۳۔ استقبالیہ ـــ (مرزا محمد خلیل) ـــ ۹

۴۔ خطاب ـــ (پرویز صاحب) ـــ ۱۲

۵۔ بزمِ مذاکرہ۔ میں نے درسِ قرآن سے کیا پایا ـــ (عزیزہ تبسم ضیاء ـــ محترم فریدالدین ـــ محترم ظفر احسن محمود ـــ محترم شیخ سراج الحق) ـــ ۲۰

۶۔ ارشاداتِ صدارت ـــ (محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب) ـــ ۳۵

۷۔ خلا کا عالمی کردار ـــ (محترم خورشید عالم) ـــ ۴۰

۸۔ نقد و نظر ـــ ۴۸

۹۔ علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی ـــ (محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر) ـــ ۴۹

۱۰۔ کراچی میں جشنِ نزولِ قرآن ـــ (محترم محمد اسلام صاحب) ـــ ۵۹

۱۱۔ باب المراسلات ـــ (دوسرا شاہد عادل) ـــ ۶۳

۱۲۔ مطالب الفرقان ـــ ۶۵ تا آخر

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵/ بی گلبرگ۔ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

باسمہ تعالیٰ

لمعات

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ چلیپا را

کشمیری راہنما شیخ محمد عبداللہ نے اپنی نظر بندی سے رہائی کے بعد اس قسم کے عجیب و غریب بیانات دینے شروع کئے ہیں، جن سے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور کیا کرینگے۔ وہ ایک طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کا حقیقی حل یہ ہے کہ اہلِ کشمیر کے حقِ ارادیت کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی ۷ر جنوری کی پریس کانفرنس میں یہ بھی کہا کہ:-

> کشمیری عوام نے بھارت کے ساتھ اس لئے الحاق نہیں کیا تھا کہ اُن سے تیسرے درجے کے شہریوں اور نو آبادیاتی غلاموں جیسا سلوک کیا جائے۔ اُن سے ایک نامہ نگار نے دریافت کیا کہ آیا وہ اب بھی بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی حمایت کرتے ہیں جو ۱۹۴۷ء میں ظہور میں آیا تھا۔
>
> شیخ صاحب نے اس کے جواب میں کہا:
>
> میں نے جو کچھ پہلے کہا تھا اُس پر آج بھی حرف بحرف قائم ہوں۔ لیکن میرے مؤقف کو ٹھیک طور سے سمجھا نہیں گیا۔ کشمیریوں نے یہ بات تسلیم کرنے میں کبھی تامل نہیں برتا کہ انہوں نے بھارت کے ساتھ اپنی رضامندی سے الحاق کیا تھا۔ لیکن اسکے بعد کیا ہوا؟ ہم آپکے ساتھ اسلئے تو شامل نہیں ہوئے تھے کہ ہمارے ساتھ تیسرے درجے کے شہریوں اور نو آبادیاتی غلاموں جیسا سلوک روا رکھا جائے۔
>
> (روزنامہ امروز۔ ۸ر جنوری ۱۹۶۸ء)

سوال یہ ہے کہ اگر کشمیریوں نے اپنی رضامندی سے بھارت کے ساتھ الحاق کر لیا تھا اور وہ اس بات کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے اور خود شیخ صاحب بھی اس مؤقف پر حرف بحرف قائم ہیں تو پھر وہ کون سا حقِ خود ارادیت ہے جسے وہ مسئلہ کشمیر کا حل قرار دیتے ہیں۔ اہلِ کشمیر کا اپنی رضامندی سے ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لینا، اُن کے حقِ خود ارادیت کا استعمال نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر شیخ صاحب اور کس قسم

کے حقِ خود ارادیت کے خواہاں ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ اُن کے اِن دونوں موقفوں میں کس قدر تضاد ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کشمیر کا سارا مسئلہ انہی شیخ صاحب کا پیدا کردہ ہے۔ انہوں نے پاکستان کے فریقِ مقابل کی حیثیت سے اقوامِ متحدہ میں جاکر یہ کہا تھا کہ اہلِ کشمیر نے اپنی رضامندی سے بھارت کیساتھ الحاق کیا ہے اور اگر شیخ صاحب آج بھی اپنے اس موقف کی تائید کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس معاملے میں وہ بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کے فریقِ مخالف کی حیثیت سے سامنے آرہے ہیں۔ انہیں بھارت سے یہ شکایت ہے کہ اس نے کشمیریوں کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر بھارت شیخ صاحب کے منشاء کے مطابق کشمیریوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کرنے پر آمادہ ہو جائے تو شیخ صاحب کے نزدیک کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائیگا۔ وہ اس قضیہ میں پاکستان کو تیسری پارٹی اس لئے شمار کرتے ہیں کہ کشمیر کا کچھ علاقہ پاکستان کے زیرِ حفاظت زندگی بسر کر رہا ہے۔ اگر بھارت کشمیریوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کرنے پر آمادہ ہو گیا تو پھر شیخ صاحب اس قضیہ کی تیسری پارٹی یعنی پاکستان سے غالباً یہ مطالبہ کرینگے کہ وہ آزاد کشمیر سے اپنی حفاظت سے دستبردار ہو جائے۔

جہاں تک پاکستان اور بھارت کا تعلق ہے شیخ صاحب کا گوشۂ ابرو اس وقت بھی بھارت کیطرف جھکا ہوا نظر آتا ہے، (مثلاً) بھارت نے حال ہی میں جو قانون پاس کیا ہے کہ جو شخص بھارت کیساتھ کسی ملحقہ علاقے کی علیحدگی کی بات کریگا وہ مملکت کا غدار تصور کیا جائے گا، تو پاکستان نے اس کیخلاف صدائے احتجاج بلند کی کیونکہ اس کا براہِ راست اثر مسئلہ کشمیر پر پڑتا تھا۔ اقوامِ متحدہ میں بھارت کے نمائندے نے پاکستان کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ یہ چیز بھارت کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔ اس پر پاکستان نے تجویز کیا کہ وہ معاملہ کو سلامتی کونسل میں لے جائیگا تو شیخ صاحب فوراً پکار اُٹھے کہ ایسا نہ کرنا اس سے میری اُن کوششوں پر بُرا اثر پڑیگا جو میں پاکستان اور بھارت کے درمیان مصالحت کے لئے کر رہا ہوں۔ یعنی بھارتی نمائندہ نے اقوامِ متحدہ کو جو مراسلہ بھیجا اُس سے تو شیخ صاحب کی مصالحانہ کوششوں پر کوئی بُرا اثر نہ پڑا، لیکن پاکستان نے جب اس کا جواب دینا چاہا تو شیخ صاحب کے قلبِ صُلح جُو میں اضطراب پیدا ہو گیا اور انہوں نے پاکستان کو اس سے باز رہنے کی تلقین کر دی۔ اس سے ہمیں اپنے ایک ملنے والے یاد آگئے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے اُن کے ایک دوست کو پیٹنا شروع کر دیا اور انہوں نے اپنے دوست کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ وہ شخص اِن کے دوست کو پیٹے جا رہا تھا اور ان کا دوست آگے سے کچھ بھی نہ کر سکتا تھا کیونکہ اس کے ہاتھ اس کے دوست نے پکڑ رکھے تھے۔ جب بعد میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے شیخ سعدیؒ کے اس ارشاد پر عمل کیا کہ ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست در پریشاں حالی و درماندگی

اس باب میں شیخ عبداللہ صاحب بھی پاکستان کے ساتھ اسی انداز سے حقِ دوستی ادا کرنا چاہتے ہیں۔

ہم نے حالات کا یہ تجزیہ اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ شیخ صاحب اپنی مصالحانہ کوششوں کو اُس مقام سے آگے بڑھانا چاہتے ہیں جس مقام پر انہوں نے انہیں ۱۹۶۴ء میں چھوڑا تھا۔ وہ اُس وقت پنڈت جواہر لال نہرو کے پیامبر کی حیثیت سے پاکستان تشریف لائے تھے اور اُن کی جیب میں مصلحت کی اسکیم یہ تھی کہ پاکستان اور بھارت میں کانفڈریشن قائم کر دیا جائے۔ ہم نے اس خطرے کو اسی وقت بھانپ لیا تھا اور طلوعِ اسلام کی جولائی ۱۹۶۴ء کی اشاعت کے لمعات میں اس کی سختی سے مخالفت کی تھی۔ ہم نے اپنی وجوہِ مخالفت بیان کرنے کے بعد لکھا تھا۔

> جو مملکتیں محض سیاسی مصالح کی بنا پر وجود میں آتی ہوں، اُن کے لئے کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا کہ جب سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہو تو وہ دوسری مملکتوں کے ساتھ فیڈریشن یا کنفڈریشن قائم کر لیں۔ حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو کسی دوسری مملکت میں مدغم ہی کر دیں۔ سیاسی مملکتیں اس کے سوا کیا ہیں کہ صفحۂ ارضی کے نقشے پر چند لکیریں کھینچ دی گئی ہیں۔ جب دو مملکتوں کے درمیان اس خطِ امتیاز کو مٹا دیا جائے تو مملکتیں ایک ہو سکتی ہیں۔ لیکن جس مملکت کا وجود اس حقیقت کا اعلان ہو کہ کفر اور اسلام، شرک اور توحید، باطل اور حق میں ادغام تو ایک طرف، کسی قسم کا اشتراک بھی نہیں ہو سکتا، وہ مملکت اپنے آپ کو کسی ایسی دوسری مملکت کے دامن کے ساتھ کیسے منسلک کر سکتی ہے جس سے وہ دین کی بنیادوں پر الگ ہوئی تھی۔ آپ کنفڈریشن کو تسلیم کیجئے تو اس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہوں گے کہ مملکتِ پاکستان سیاسی وجوہ کی بنا پر وجود میں لائی گئی تھی۔ اور جب ہم اس حقیقت کا اعتراف کر لیں تو بھارت سے الگ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ اُن کے ایک رفیقِ خاص خواجہ مبارک شاہ بھی پاکستان تشریف لائے تھے۔ شیخ صاحب تو پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات کی خبر سنتے ہی واپس تشریف لے گئے تھے لیکن یہ خواجہ صاحب اُن کے بعد قریب ایک ماہ تک پاکستان میں گھومتے پھرتے رہے۔ اور ۲۸ جون ۱۹۶۴ء کی دوپہر کو جب وہ نئی دلی کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو انہوں نے لاہور کے ہوائی اڈے پر اخبارات کے نمائندوں سے کنفڈریشن کی اسکیم کے سلسلے میں کہا تھا کہ

> پاکستان ایک جدید لادینی ریاست کی خصوصیات کا حامل ہے اور چونکہ بھارت بھی ایک لادینی مملکت ہے اس لئے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور باہمی یگانگت پیدا کرنے کیلئے ایک یہ بنیاد موجود ہے۔

—— اُن کا یہ بیان کنفڈریشن کی اُس اسکیم کی غمازی کر رہا تھا جسے شیخ صاحب ایک پیامبر اس کی حیثیت سے اپنی جیب میں لائے تھے۔ اُس وقت اس کا کسی کو بھی علم نہیں ہو سکا تھا کہ حکومتِ پاکستان کی طرف سے متعیّنہ طور پر اس کا کیا جواب دیا گیا تھا لیکن صدر محمد ایوب خان نے اپنی خود نوشت سوانح حیات —FRIENDS, NOT MASTERS— میں اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کنفڈریشن کی ایسی اسکیم اپنے ساتھ لائے تھے اور صدر محترم

نے انہیں واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ پاکستان اس قسم کی کسی اسکیم کو سننے کیلئے تیار نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ

> ہندوستانی قومیت کا مدار ہندو مذہب پر ہے اور پاکستان کی قومیت کی بنیاد اسلام پر ہے۔ یہ دونوں فلسفہ ہائے حیات بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں' اس لئے ان دو قومیتوں کے یکجا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۱۲)

ہمیں اس کتاب میں صدرِ محترم کا یہ بیان پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی اور ہم نے انہیں اس حق گوئی پر درخورِ صد مبارکباد سمجھا۔ اس سے ہمیں توقع بندھ گئی ہے کہ اگر شیخ صاحب یا کوئی اور پیامبرِ امن و مصالحت اس قسم کا کوئی لغو فارمولا لیکر پاکستان آئیگا تو صدرِ محترم کا ردِ عمل اسی قسم کا ہوگا جس قسم کا ۱۹۶۵ء میں ہوا تھا اور جس سے انہوں نے اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی صحیح ترجمانی کی تھی۔

اس موقع پر ہمیں خاص طور پر اس یاد دہانی کی ضرورت اس لئے پڑی ہے کہ ایک طرف بدقسمتی سے ہماری قوم بڑی جذباتی واقع ہوئی ہے اور دوسری طرف قوم میں ایسے تخریب پسند عناصر موجود ہیں جنہوں نے پاکستان کی جداگانہ مملکت کے وجود کو ابھی تک اپنے دل سے نہیں اپنایا۔ یہ لوگ عوام کی اس جذبات پرستی سے بڑا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ قوم کی اسی جذباتیت اور زود فراموشی کا نتیجہ تھا کہ جب شیخ محمد عبداللہ ۱۹۶۴ء میں پاکستان آئے ہیں تو ان کا یوں استقبال کیا گیا گویا خود قائداعظمؒ دوبارہ تشریف لے آئے ہیں۔ اور قوم قطعاً بھول گئی کہ یہی شیخ صاحب ہیں جن کی وجہ سے سارا مسئلہ کشمیر پیدا ہوا تھا۔ اور جو اسوقت بھی اپنی آستین میں کنفڈریشن جیسی ہلاکت آفریں اسکیم چھپا کر لائے تھے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ انسان کا دل بدل سکتا ہے' اُسکے فیصلے بھی بدل سکتے ہیں' اُس کے ارادوں میں بھی تبدیلی آسکتی ہے' وہ اپنی غلط کوششوں پر نادم بھی ہو سکتا ہے اور اُن کی اصلاح کے لئے آمادہ بھی۔ ہم شیخ عبداللہ صاحب کو بھی اس تبدیلیٔ قلب کے امکان سے مستثنیٰ نہیں سمجھتے اور اگر اُن میں فی الواقعہ دیانتداری سے یہ تبدیلی پیدا ہو چکی ہے اور وہ مسئلہ کشمیر کا اس کے سوا اور کوئی حل نہیں سمجھتے کہ اہلِ کشمیر کو یہ فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے کہ وہ اپنا الحاق پاکستان کے ساتھ چاہتے ہیں یا بھارت کیساتھ' تو ان کی یہ تبدیلیٔ قلب مظلومینِ کشمیر کیلئے ایک نیک فال ہوگی اور ہم بسر و چشم اُسکا استقبال کرینگے۔ لیکن جب تک اس کے لئے کوئی مثبت بنیاد ہمارے سامنے نہ آجائے ہمیں چند خوش کُن بیانات سے جذبات کی رو میں نہیں بہہ جانا چاہیئے۔ مسئلہ بڑا نازک ہے اور بھارت اپنی عیاری میں انتہا ہے کا مدود فراموش۔ اس لئے ہمیں ان امور میں بڑی ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔

پاکستان کا موقف حق و صداقت پر مبنی ہے' اگر شیخ عبداللہ دیانتداری سے اسکی حمایت کرتے ہیں تو ہمیں اس سے خوشی ہوگی اور اگر شیخ صاحب کوئی اور غلط فارمولا وضع کرینگے تو ہم اسکی بھی اسی طرح مخالفت کرینگے جسطرح بھارت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ہماری مخالفت یا موافقت نہ اشخاص سے ہے نہ اقوام سے۔ بات اصولی ہے۔ جو حق و صداقت کا ساتھ دیگا ہم اُسکی تائید کرینگے۔ جو اسکے خلاف جائیگا' ہماری اُس سے مخالفت ہوگی ۔۔ وذالک الدین القیم۔

والمرقوم ۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۸ء

ایک سہانی اور نورانی تقریب

جشنِ چہاردہ صد سالہ نزولِ قرآن۔ سالانہ جشنِ نزولِ قرآن۔ و جشنِ تکمیل درسِ قرآن کریم

کچھ سال اُدھر، جب طلوعِ اسلام نے عید الفطر کو جشنِ نزولِ قرآن کے طور پر منایا تو اکثر ذہنوں کو یہ اصطلاح کچھ اوپری اوپری سی محسوس ہوئی، اور ہمیں بہ اصرار و تکرار اس کی وضاحت کرنی پڑی کہ عید الفطر درحقیقت نزولِ قرآن کا جشنِ مسرت ہے جسے منانے کا حکم خود خدا نے دیا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یہ تصور رفتہ رفتہ عام ہوتا گیا اور جشنِ نزولِ قرآن کی آواز ہر محراب و منبر سے سنائی دینے لگی۔ پھر اس تصور نے بین الملّی وسعت اختیار کر لی اور اس سال یہ خیال ابھرا کہ نزولِ قرآن کریم کا چودہ سو سالہ جشن منایا جائے۔ ہماری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اس سے پہلے جشنِ نزولِ قرآن کبھی نہیں منایا گیا اور نہ ہی اس باب میں "چودہ سو سال" کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس تصور کا نتیجہ ہے، کہ امت کو نزولِ قرآن کا جشن منانے کا خیال آیا، فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ خدا کرے کہ یہ جشن ساری امت میں ہر سال اسی شان و شوکت اور تزک و احتشام سے منایا جایا کرے کہ اس سے قرآن کا چرچا عام ہوتا ہے اور اس کی اہمیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ورنہ ہم نے تو اس کتابِ جلیل و جمیل کو محض مُردوں کو ثواب پہنچانے، یا پلا سمجھے تراویح میں ختم کرنے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔

بزمِ طلوعِ اسلام لاہور نے حسبِ معمول اس سال بھی سالانہ جشنِ نزولِ قرآن منانے کا اہتمام کیا تو اس تقریب میں، چہاردہ صد سالہ جشن کی تقریب بھی شامل ہو گئی۔ اور حسنِ اتفاق کہ پرویز صاحب کا ہفتہ واری درسِ قرآن، جو گذشتہ سات سال سے مسلسل جاری تھا، ۳۱ دسمبر ۱۹۶۷ء کو بحسن و خوبی تکمیل تک پہنچ گیا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ اس منزلِ شوق کے اس طرح اختتام پذیر ہونے پر، بحضور رب العزت سجدۂ شکرانہ ادا کیا جائے۔ یوں یہ تقریبِ سعید بھی اسی جشن میں شامل کر دی گئی۔ چنانچہ ۷ جنوری ۱۹۶۸ء (اتوار کا دن) اس سہ گانہ جشن کے لئے مختص کیا گیا۔

کارکنانِ بزم کے حسنِ ذوق نے، ہفتہ کی شام ہی کو ۲۵۔ بی گلبرگ کے صحن کو صحنِ گلستان میں تبدیل کر دیا۔ اور اس کے در و بام کو رنگین چراغوں سے رشکِ صد کہکشاں بنا دیا۔ اتوار کی صبح، اربابِ شوق نے، فوج در فوج جشن گاہ کی طرف آنا شروع کر دیا۔ ان میں مقامی حضرات بھی تھے اور دیگر مقامات کی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے نمائندگان بھی۔

چنانچہ تقریب کے آغاز سے بہت پہلے پنڈال ، ہجوم شائقین سے اپنی تنگ داماں کا شکوہ سنج ہوگیا ۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے بزم درس کے نیرِ تاباں ، محترمی ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب زینتِ دو مسندِ صدارت ہوئے ۔ اور تقریب کا آغاز محترم میرزا محمد خلیل صاحب کی تلاوتِ قرآنِ پاک سے ہوا ۔ اس کے بعد مغنیِ آتش نفس ، محترم نذیر فاروقی صاحب نے (جو اس تقریب کے لئے خاص طور پر سیالکوٹ سے تشریف لائے تھے) کلامِ اقبالؒ سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا ۔ ازاں بعد ، ادارۂ طلوعِ اسلام کے ناظم ، اور بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے نمائندہ ، میرزا محمد خلیل صاحب نے اپنا سپاسنامہ پیش خدمت سامعین کیا ۔ پھر مفکرِ قرآن مائیک پر تشریف لائے اور انتہائی جذب و کیف کے عالم میں وہ فکر آفریں اور وجد آور خطاب ارشاد فرمایا جو چند صفحات بعد ، وجہ بصیرت افروزیِ قارئین ہوگا ۔

اس تقریب کے فیصلہ پر سامعینِ درس نے اپنے اس جذبۂ شوق کا اظہار کیا تھا کہ وہ درس کے متعلق اپنے تاثرات پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ جذبہ بڑا مبارک تھا ۔ چنانچہ طے پایا کہ اس جشن میں ایک مذاکرہ منعقد کیا جائے جس کا عنوان ہو ۔۔۔

"میں نے اس درس سے کیا پایا ؟"

قارئین کو معلوم ہے کہ ہمارے اس قسم کے قرآنی مذاکرات کی ابتدا ، فکرِ قرآنی کی شیدائی ، محترمہ بہن ثریا عندلیب کے مقالہ سے ہوا کرتی ہے ۔ وہ اس جشن میں شرکت کے لئے تیاری کر رہی تھیں کہ ایک ماہ قبل انہیں وہ قیامت خیز حادثہ پیش آگیا جس کا تذکرہ طلوعِ اسلام میں کیا جا چکا ہے ۔ یعنی ان کے رفیقِ حیات ، محترم حبیب اللہ خان کا ناگہانی انتقال ہوگیا ۔ اور اس طرح محترمہ بہن کا یہ جشن ، ماتم میں بدل گیا ۔ اس جشن کی تقریب پر انہوں نے اپنے قرآنی ساتھیوں کے نام ایک پیغام بھیجا جسے محترمہ بہن بیگم سلام نے پڑھ کر سنایا ۔ اس پیغام کا ایک ایک لفظ درد و غم کا نشتر تھا جو سیدھا رگِ جاں میں پیوست ہوتا چلا جاتا تھا ۔ یہ پیغام سنایا جا رہا تھا اور کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جو اشکبار نہ ہو اور کوئی قلب ایسا نہیں تھا جو وقفِ اضطراب نہ ہو ۔

اس کے بعد مذاکرہ شروع ہوا جس میں حسبِ ذیل شائقینِ قرآن نے حصہ لیا اور بتایا کہ انہوں نے اس درس سے کیا پایا ۔

۱ ۔ عزیزہ تبسم ضیاء ، (طالبہ جماعت دہم) ، ڈسکہ
۲ ۔ عزیز شوکت پرویز (طالب علم جماعت نہم) لاہور
۳ ۔ محترم قمر بٹ صاحب
۴ ۔ عزیز منیر خالد ۔ متعلم بی اے
۵ ۔ محترم رحیم بخش صاحب
۶ ۔ عزیز فرید الدین ، متعلم بی اے
۷ ۔ محترم خالد سلام ، پروفیسر انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور
۸ ۔ چوہدری علی محمد صاحب (FOOD TECHNOLOGIST)
جنہوں نے قرآن کریم کے بعض سائنٹیفک گوشوں پر بڑے دلچسپ انداز میں [illegible]
۹ ۔ محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر
۱۰ ۔ عزیزہ عفت خلیل ، (طالبہ سیکنڈ ائیر) لاہور
۱۱ ۔ محترم میاں ظفر احسن محمود ۔ ایڈوکیٹ
(۱۲) محترم شیخ سراج الحق صاحب اور
۱۳ ۔ محترمہ بیگم خضر عارفی

یہ مقالات و خطابات اس قدر جاذب تھے کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ احباب جو دیکھا تو گھڑی ڈیڑھ بجا رہی تھی۔ اس پر سردی کی شدت۔ چنانچہ صدرِ محترم نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اپنے مقالہ کو ملتوی کر دیں اور مذاکرہ کا اختتام اپنے مختصر ارشادات سے کر دیں۔ (یہ مقالہ اتوار، ۱۴ جنوری کو، ایک خاص اجتماع میں سنایا گیا)۔ اس طرح، محترم پرویز صاحب کی خدمت میں ہدایائے تشکر و امتنان پیش کرنے کے بعد، اس جشن کی پہلی نشست برخاست ہوئی۔

جشن کی دوسری نشست کا آغاز شام کے ساڑھے چھ بجے، ایک سادہ اور سجیلے کھانے سے ہوا۔ اس کے بعد ملک کے ممتاز ترین (پنجابی زبان کے) شاعر، محترم آشفتہ صاحب اور نذیر فاروقی صاحب نے شعر و نغمہ کی اس پاکیزہ محفل کو قریب نصف شب تک گلرنگ و فردوس آہنگ بنائے رکھا اور یوں اس جشنِ مسرت کا اختتام ہوا۔ آئندہ صفحات میں، اس مذاکرہ کے چند ایک مقالات قارئین کے سامنے آئیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ قلتِ گنجائش کی وجہ سے یہ تمام مقالات درج نہیں کئے جا سکے۔

ایک خصوصی اعلان

سامعینِ درس کا اصرار تھا کہ محترم پرویز صاحب اپنے اس درس کا دوسرا دور شروع کر دیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے طویل و عریض پروگرام کو التزاماً جاری رکھنا بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے اور پرویز صاحب اب عمر کے اس حصہ میں پہنچ رہے ہیں جہاں مسافتیں طویل ہونے کے بجائے سمٹ جانی چاہئیں۔ پھر ان کی بے پناہ مصروفیتوں نے ان کی صحت پر بھی خاصہ اثر ڈالا ہے۔ لیکن وہ چونکہ اپنی زندگی کو قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر چکے ہیں، اس لئے انہوں نے احباب کے اس تقاضائے شوق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔۔۔ لیکن اپنی صحت کی بحالی کے لئے، صرف دو ماہ کے وقفہ کی "درخواست کی" جس پر احباب نے بادلِ ناخواستہ، رضامندی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اب اس درس کا ازسرِنو سلسلہ، وسط مارچ سے شروع کیا جائے گا۔ اب کے وہ اسے نصاب کے انداز سے جاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ شمعِ قرآنی کے اس پروانے کی عمر میں برکت اور صحت عطا فرمائے تاکہ ہم تشنگانِ زمزمِ قرآنی، ان کے چشمۂ فیض سے زیادہ سے زیادہ سیراب ہو سکیں۔

جشنِ نزولِ قرآن، وتکمیلِ درسِ قرآن

(۶ جنوری ۱۹۷۸ء)

اِستقبالیہ

مرزا محمد خلیل ۔ نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام ۔ لاہور

صدرِ محترم ۔ عزیز بہنو اور بھائیو! ــــ سلام و رحمت!

مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے اکثر احباب کے ذہنوں میں ابھی تک اُس کیف آور تقریب کے اثرات محفوظ ہوں گے جو ہم نے آج سے تقریباً اڑھائی سال پیشتر موسم برسات کی ایک سہانی اور خوشگوار صبح کو اپنے محسنِ اعظم محترم پرویزؔ صاحب کے بصیرت افروز ہفتہ وار درسِ قرآن کے سلسلے کے نصف تک یعنی پندرہ پاروں تک پہنچنے پر اسی درس گاہ اور مرکزِ قرآنی میں "جشنِ قرآن العظیم" کے نام سے بدرگاہِ ربّ العزت سجدۂ شکرانہ پیش کرنے کے لئے منائی تھی۔

الحمدللہ! کہ مبدءِ فیض کی کرم گستری سے ہم آج پھر اس قابل ہوئے ہیں کہ درسِ قرآن کے اس سلسلۂ دراز کے، سات سال کے بعد، تکمیل تک پہنچ جانے پر اُس کے حضور ایک اور سجدۂ تشکر و امتنان ادا کر سکیں کہ اُس نے ہمیں ایسے عام بے راہ روی کے زمانے میں ایک ایسا مردِ راہ دان، مفکرِ قرآن اور داعیِ انقلاب عطا فرمایا جس نے قرآنِ کریم کے عمیق سمندر میں غوطہ زنی کر کے ہمیں اُس کے بیش بہا موتیوں سے مالامال کیا۔ جس نے اُس کتابِ عظیم کے غائر مطالعہ سے یہ حقیقت کشائی کی کہ ہمیں خدا کی طرف سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دینِ خالص یعنی ایک مکمل نظامِ زندگی ودیعت ہوا تھا لیکن قرنہا قرن کے جمود و تعطل اور مفاد پرست قوتوں کی ساز باز نے اسے ایسا ہی پوجا پاٹ کا مذہب بنا کر رکھ دیا ہے، جیسے اور مذاہب ہیں، جنہیں انسان کی معاشرتی زندگی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ جس نے قرآن کی انقلاب آور اور باطل شکن تعلیم پر صدیوں سے پڑے ہوئے پردوں کو ایک ایک کر کے علیحدہ کیا اور اُس کے نیچے سے ایک صاف اور شفاف حیات بخش نظامِ زندگی کی جزئیات تک سے ہماری

نگاہوں کو روشن کیا، جس نے اُن سازشوں کی نقاب کشائی کی جو قرآن کو محض حصولِ ثواب کے لئے پڑھنے، چومنے یا اُس سے تعویذ بنانے کو ہی اس کا مقصد قرار دے چکی تھیں۔ جس نے ہمیں خدا کا صحیح قرآنی تصور دیا۔ جس کی رو سے انسان خدا کی صفات کو اپنے اندر بشریت کی حدود میں رہتے ہوئے منعکس کرتا ہے اور یوں اُس نیچ اعلیٰ کا رفیقِ ادنیٰ بن جاتا ہے جس نے جزا و سزا اور نجات کے مروجہ تصور کو قرآن کی رو سے باطل قرار دیا۔ اور یہ واضح کیا کہ ہدایت یافتہ انسان کی منزلیں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بلند بھی ہوتی جاتی ہیں۔ اور یہ کہ جزا و سزا انسانی اعمال کے فطری نتائج ہیں نہ کہ سرزنش و بخشائش ــــ جس نے بیسیوں ادق مسائل، جو ہمارے لئے معمے بنے ہوئے تھے، اپنی خداداد بصیرتِ قرآنی سے ایک ایک کا تجزیہ کر کے، اُن کی اصل و حقیقت سے ہمیں روشناس کرایا۔ بغرض پرویز صاحب کا یہ سلسلۂ درسِ قرآن اس قدر ہمہ گیر تھا کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق بنیادی رہنمائی ہمیں یہاں سے نہ مل سکی ہو اور ہم اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی فرماں و نازاں ہوں کم ہے۔

عزیزانِ من! میرے لئے یہ امر دو گونہ باعثِ افتخار و مسرت ہے کہ عرصہ تیس سال سے زائد گزرا، جب میں محترم پرویز صاحب کے فکرِ قرآنی سے پہلی بار متأثر ہوا تھا اور اُس کے بعد کوئی وقت ایسا نہیں آیا، جب میں اس سے عملاً متمسک نہ رہا ہوں۔ بلکہ یہ تعلق اور تأثر مدتِ عمر کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ گہرا اور پختہ ہوتا چلا گیا اور ہوتا رہے گا۔ انشاء اللہ! ــــ پاکستان کے قیام کے بعد جب محترم پرویز صاحب نے کراچی میں سلسلۂ درس قائم کیا، تو میں بسلسلۂ ملازمت لاہور میں تھا اور شروع تک میں بزمِ لاہور کے اُن دیرینہ احباب میں سے تھا جو دس سال سے اس بُعدِ مکانی کو مجبوراً برداشت کئے ہوئے تھے اور آرزومند تھے کہ محترم پرویز صاحب کا قرآنی مرکز مستقل طور پر لاہور میں بننا چاہیئے۔ ۱۹۵۵ء میں محترم پرویز صاحب نے قبل از وقت پنشن حاصل کر لی تاکہ وہ اپنے ہمہ اوقات و توجہات اپنی زندگی کے قرآنی مشن کے فروغ کے لئے وقف کر سکیں۔ تو رفیقِ محترم شیخ سراج الحق صاحب کے ساتھ میں بھی اس آرزو کا ہمنوا تھا (جو ایک حد تک اُس مشترکہ مشن کے ساتھ دلی لگاؤ پر مبنی تھی) کہ اب کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ محترم پرویز صاحب کی درس گاہ کا مرکز یہاں منتقل ہو جائے۔ اس سلسلے میں جو موانعات حائل تھیں، اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بھی تھوڑی سی سعادت میرے حصے میں آئی اور بحمداللہ اپریل ۱۹۵۸ء میں پرویز صاحب لاہور تشریف لے آئے اور موجودہ دارالقرآن و درسگاہ تعمیر ہو کر جولائی ۱۹۵۸ء سے سلسلۂ درس شروع ہوا۔ ابتداءً درس کے موضوعات اسلام کے بنیادی تصورات اور اصطلاحات رہے، جن کے بغیر مسلسل درسِ قرآن کی تفہیم آسان نہ ہو سکتی تھی۔ باقاعدہ درسِ قرآن مسلسل ستمبر ۱۹۶۰ء میں شروع ہوا، جس کی تکمیل ایک مدتِ طویل یعنی

سوا سات سال کے بعد گزشتہ اتوار (۲۸ جنوری ۱۹۶۸ء) کو بخیر و خوبی عمل میں آئی اور آج ہم اس نورانی تقریب کو منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

اگرچہ سامعینِ درس میں سے کافی تعداد ایسے احباب کی ہے جو باقاعدگی سے اس میں شرکت فرماتے رہے ہیں لیکن قرآنِ پاک سے جس قدر شغف و عقیدت محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کو ودیعت ہوئی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ درس میں پورے ذوق و انہماک کے ساتھ اس سلسلے کے اہم نکات کو انہوں نے جس اہتمام کے ساتھ محفوظ کر لیا ہے، اس کا اندازہ ان کے بلیغ مضامین و خطابات سے ہوتا ہے جو وہ سالانہ کنونشنز اور دیگر اہم اجلاس میں پیش فرماتے رہے ہیں۔ اسی طرح مفکرِ قرآن کی ذات سے ان کا لگاؤ بھی عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے، جس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں محترم پرویز صاحب کو کبھی ڈاکٹر صاحب کے زیرِ علاج دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ درسِ قرآن کی نصف منزل طے ہونے پر جشنِ قرآن العظیم منعقد کرنے کی تجویز بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کی تحریک تھی اور آج کی تقریب کے انعقاد کے سلسلے میں بھی ان کی ذات پیش پیش رہی ہے۔

یہاں تک ہم نے اس تقریب کے صرف اس حصہ کا ذکر کیا ہے، جس کا تعلق پرویز صاحب کے درسِ قرآن مجید کی تکمیل سے ہے لیکن حسنِ اتفاق سے اس کے ساتھ دو تقاریب اور بھی شامل ہو گئی ہیں جو اپنی عظمت و اہمیت کے اعتبار سے اس کی ہمدوش ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بزمِ طلوعِ اسلام کی طرف سے ہر سال عیدالفطر کی تقریب پر جشنِ نزولِ قرآن منایا جایا کرتا ہے اور امسال تمام عالمِ اسلام میں نزولِ قرآن کا چودہ سو سالہ جشن بھی انہی دنوں منایا جا رہا ہے۔ یوں ہماری یہ تقریب سہ آتشہ ہو گئی ہے۔ ضمناً اتنا عرض کرنا غیر محل نہ ہوگا کہ عیدالفطر کے متعلق یہ بھی محترم پرویز صاحب ہی نے بتایا تھا کہ یہ درحقیقت نزولِ قرآن کریم کا جشن ہے ورنہ صدیوں سے اسے محض روزوں کے اختتام کی تقریب کہا جاتا تھا۔ اس مفہوم کے پیشِ نظر ہم نے یہاں عید کی تقریب کو جشنِ نزولِ قرآن سے تعبیر کیا تھا اور یہی مفہوم پھیل کر جو عالمگیر ہوا ہے تو امسال ساری دنیا میں جشنِ نزولِ قرآن منایا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس کے متعلق نہ اس سے پہلے کبھی کسی کو اس کا خیال تک آیا اور نہ ہی "چودہ سو سال" کو اس ضمن میں کوئی خاص اہمیت حاصل ہے۔ بہرحال یہ دونوں تقاریب بھی ہمارے اس جشن کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ فالحمدللہ علےٰ ذالک!

آخر میں، میں بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے ارکان کا، جنہوں نے درسِ قرآن کے اہتمام و انصرام میں متواتر کوشش کر کے اسے حسن و خوبی سر انجام دیا ہے، شکر گزار ہوں۔ اس تقریبِ سعید کے انعقاد میں بھی میرے یہ رفیق و احباب لائقِ تبریک و تشکر ہیں کہ انہوں نے آپ تمام احباب سے مل کر جشن کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ والسلام!

جشنِ نزولِ قرآن و تکمیلِ درسِ قرآن

خطاب

(پرویز صاحب)

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال

محبی و محترمی ڈاکٹر صاحب۔ عزیز بہنو اور بھائیو! سلام و رحمت!

یوں تو انسانی زندگی سلسلۂ روز و شب ہی سے عبارت ہے، لیکن اس سلسلہ میں بعض کڑیاں ایسی بھی آ جاتی ہیں جنہیں بجا طور پر سرمایۂ حیات اور حاصلِ زندگی قرار دیا جا سکتا ہے۔ میری زندگی میں آج کا دن اس سلسلہ کی ایک ایسی ہی کڑی ہے۔ اس دن کی یاد، بقایا زندگی میں، میرے لئے وجہ بالیدگیٔ روح اور باعث شادابیٔ قلب ہوگی۔

(۲) میں عزیزانِ گرامی قدر! قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں، اور یہی میری متاعِ حیات اور مایۂ افتخار ہے۔ میری زندگی کا ابتدائی دور، قدامت پرستی کی تنگ ناؤں میں گزرا۔ کبھی مسجد کے حجروں میں، قال۔ اقوال کی بحث و جدل میں اور کبھی خانقاہوں کے خلوت کدوں میں منازلِ تصوف کی رہ نوردی میں۔ یہ وہ دور تھا جس میں، چشم بند و گوش بند و لب بہ بند، معراجِ علم۔ اور، بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید، اوجِ روحانیت سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب میرے شعور کی آنکھ بیدار ہوئی تو فکر و تدبر کی تابندہ شعاعوں نے جمود کی اُن برفانی سلوں کو آہستہ آہستہ پگھلانا شروع کیا جو کورانہ تقلید اور اندھی عقیدت کے یخ خانہ (کولڈ سٹوریج) کی فطری پیداوار تھیں ۔۔۔ میں، عقل و فکر کے چراغ گل کر دینے والی ماضی پرستی کے تیرہ و تاریک غاروں سے نکل کر، بتیشۂ فہم و فراست سے اپنی راہیں آپ تراشنے کی دعوت دینے والی تابناک وادیوں میں کس طرح پہنچا، یہ ایک طویل داستان ہے جسے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ بہرحال، ان وادیوں میں پہنچکر جب جمود و تعطل کی برفانی سلیں پگھلنی شروع ہوئیں تو ان کے نیچے دبی ہوئی شکوک و شبہات کی پھانسیں یوں ابھرنے لگیں جس طرح عرقِ لیموں سے لکھے ہوئے حروف کاغذ کو آگ کے سامنے لانے سے

ایک ایک کرکے نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دور میری زندگی کا تلخ ترین زمانہ تھا۔ اس میں وہ جنت مجھ سے چھن چکی تھی جو فسونِ خود فریبی کی تخلیق تھی اور فردوسِ یقین آفریدہ کی طرف جانے والا راستہ نگاہوں کے سامنے نہیں آرہا تھا۔ ریب و تشکیک کے سانپ متواتر ڈستے چلے جاتے تھے اور اُن کے زہر کا تریاق کہیں سے میسر نہیں آرہا تھا۔ میرے سابقہ ایمان کا ایک ایک گوشہ، اعتراضات کے طوفانوں کی نذر ہوتا جارہا تھا ــــ اور دلیل و برہان کی کوئی دیوار ایسی نہ تھی جو ان کی یورشوں کو روک سکے۔ میں تحیّر کی ان وادیوں میں برسوں مارا مارا پھرتا رہا۔ عدمِ یقین کے نشتروں سے میرا قلب، بہ رنگِ غنچہ لبریزِ جراحت اور فقدانِ ایمان کی برق سامانیوں سے میرا سینہ پروردۂ آغوشِ محشر بنا رہا۔ یہ ویسا ہی دور تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومیؒ، کبھی پیچ و تابِ رازیؒ

شکوک و شبہات کی تلاطم خیزیوں میں صرف ایک روشنی کا مینار تھا جس نے میری کشتیٔ امید کو نذرِ طوفان ہونے سے بچالیا۔ یہ مینارۂ پر لنگر، یہ ساحل تھا حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر میرا یقینِ محکم۔ جب اعتراضات کی اضطراب انگیز موجیں، خدا، وحی، آخرت پر ایمان کو متزلزل کرنے کے لئے اٹھتیں تو صرف یہ خیال ان کے راستے میں حائل ہوجاتا کہ جس انسان کی سیرت ایسی بلند ہو وہ نہ تو خود فریبی کا شکار ہوسکتا ہے، نہ فریب دہی کا مرتکب۔ اس لئے اُس نے جن حقائق کے مبنی بر صداقت ہونے کی شہادت دی ہے انہیں پرکھے بغیر جھٹک نہیں دینا چاہیئے۔ یہ تھا، عزیزانِ محترم! سیرتِ محمدیہؐ پر میرا ایمان، جس نے میری زندگی کے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ اور میں نے سابقہ توہمات سے خالی الذہن ہو کر، قرآن کریم کو علم و بصیرت کی روشنی میں از خود سمجھنے کی کوشش شروع کی۔ اس ہمت طلب سفرِ زندگی، اور صبر آزما مراحلِ حیات میں مجھے کس کس قسم کی سنگلاخ زمینوں سے گزرنا پڑا، اور ان میں مجھے کہاں کہاں سے راہنمائی ملی، کیسی کیسی کوہکنی اور خارہ شگافی سے میرا واسطہ پڑا، اور میں نے کس جگر سوزی اور نفس گدازی سے راستے کے ان مواقعات کو دور کیا، یہ داستان بڑی طویل ہے اور فرصت طلب۔ اس وقت میں صرف اتنا عرض کردینے پر اکتفا کروں گا کہ میں قریب پچیس سال سے مسلسل قرآن کریم پر غور و فکر کرتا چلا آرہا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں آج، بہ کمالِ عجز و نیاز لیکن بہ تمام حزم و یقین، اس حقیقت کے اعلان کرنے کے قابل ہوں کہ خدا کی اس کتابِ جلیل کے ایک ایک لفظ کی صداقت پر میرا محکم یقین ہے۔ اور یہ ایمان علم و بصیرت پر مبنی اور دلائل و براہین پر استوار ہے۔ اس نعمتِ کبریٰ کے حصول پر جہاں میرا سرِ نیاز، بحضور رب العزت سجدہ ریز ہے، وہاں میری جبینِ شوق، اُس ذاتِ اقدسؐ، اُس چراغِ آفرینش، اُس شاہدِ دین و جانِ ایمان

کی بارگاہ عزت مآب میں سراپاسپاس ہے جس کے حسن سیرت کی جلوہ باریوں نے میری نگاہوں کو وہ نورِ بصیرت عطا کر دیا جس سے میں قرآنی حقائق پر یقینِ محکم سے از سر نو مسلمان ہونے کے قابل ہو گیا۔ اور صرف مسلمان ہونے کے قابل ہی نہیں بلکہ خدائے زندہ کی اس کتاب زندہ کے متعلق جو ہر دیدہ بینا کے لئے بہارِ گفتنی اور ہر گوش نصیحت نیوش کے لئے عید شنیدن ہے، اقبالؔ کی ہم نوائی میں یہ کہنے کے قابل بھی کہ ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست' چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت' جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد' جہاں دیگر شود

جب اس کتاب عظیم کے حقائق، مجلۂ ذہن کو منور کرتے ہیں تو اس کا ایک ایک ذرہ جوشِ انا الشرق سے رشکِ صد آفتاب ہو جاتا ہے، اور جب اس کے بصائر خلوت کدۂ قلب کو وسعت آشنا کرتے ہیں تو خونِ رگِ حیات کا ایک ایک قطرہ دعوائے انا البحر سے آفاق گیر و کائنات در آغوش ہو جاتا ہے۔ قرآن، عزیزانِ من! مذہبی دنیا کی جنتر منتر کی کتاب یا خالی پند و نصائح کا مجموعہ نہیں۔ یہ وہ ضابطۂ قوانین ہے جس کے مطابق یہ سارا کارگہِ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ یہ وہ میزانِ عدل ہے جس میں افراد و اقوام کے ایمان تلتے، اور ان کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جو قوم اس کے بنائے ہوئے راستے پر چلتی ہے' اسے اس دنیا میں بھی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوتی ہیں اور وہ مستقبل (آخرت) کی خوشگواریوں اور شادکامیوں سے بھی نوازی جاتی ہے۔ جو اس راہ کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرتی ہے' وہ یہاں بھی ذلیل و خوار ہوتی ہے' اور آخرت میں بھی روسیاہ و شرمسار ــــــ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۔ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ۔ (۲۲/۱۱)

ــــــــ(۰)ــــــــ

قرآن کریم پر غور و تدبر ہی سے میں نے' عزیزانِ گرامی قدر! اس ارشادِ خداوندی کو بھی سمجھا کہ جس شخص کو قرآن فہمی کی توفیق عطا ہو جائے' اس پر یہ فریضہ عاید ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے اسے دوسروں تک بھی پہنچائے۔ اس ارشادِ خداوندی کی روشنی میں میں نے یہ اپنی ذمہ داری سمجھی کہ ــــــ دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دوں۔ چنانچہ میں گزشتہ قریب تیس سال ہی سے' اپنی بساط کے مطابق' اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروف چلا آ رہا ہوں۔ میری تصانیف' میرے مقالات' میری تقاریر' سب اسی فریضہ کی ادائیگی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت درسِ قرآن کریم کو حاصل ہے کہ اس میں قرآنی حقائق اس طرح بار بار سامنے آتے ہیں کہ یہ آہستہ آہستہ ذہن کی گزرگاہوں سے آگے بڑھ کر قلب کی گہرائیوں تک میں اترتے

چلے جاتے ہیں۔ میں نے اس سلسلہ کو ۱۹۵۳ء کے قریب کراچی میں شروع کیا تھا۔ یہ وہاں مسلسل جاری رہا تاآنکہ میں ۱۹۵۵ء میں لاہور منتقل ہو کر چلا آیا۔ اور اس سلسلہ کو یہاں جاری کر دیا۔ ابتدائی دو سال، قرآن کریم کے بنیادی تصورات پیش کرنے میں صرف ہو گئے اور اس کے بعد ۱۹۶۱ء سے، اس کا مسلسل درس شروع کر دیا گیا۔ للہ الحمد! کہ سات سال سے زائد عرصہ دراز کی ہفتہ واری نشستوں میں یہ مبارک و مسعود سلسلہ، بایں حسن و خوبی، اب تکمیل تک پہنچ گیا ہے اور آج کی لبریز تبریک و تہنیت تقریب اسی کا جشنِ مسرت ہے۔ میں جب سترہ سال کی ان گزری ہوئی منزلوں پر نگہ "بازگشت" ڈالتا ہوں، تو میرا سرِ نیاز بدرگاہِ رب الناس، بصد تسلیم و تکریم جھک جاتا ہے کہ اس نے مجھے اس قدر حوصلہ طلب فرما دینے کے بعد اس جوئے شیر کے لانے کی توفیق عطا فرمائی۔

———— ◇ ————

قرآن فہمی کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس میں جو قوانین و احکام اور اصول و اقدار مذکور ہیں وہ محکمات ہیں۔ یعنی ان کا مفہوم متعین ہے۔ لیکن ان کی تائید و شہادت میں جو حقائق بیان ہوتے ہیں وہ تشبیہات و استعارات کے انداز میں سامنے لائے گئے ہیں جنہیں اپنی اپنی علمی سطح کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے ان حقائق کا تعلق، خارجی کائنات اور انسانی زندگی کے مختلف گوشوں سے ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان حقائق کے ادراک کے لئے، کائنات اور انسانی دنیا سے متعلق مختلف علوم تک دسترس ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ کسی ایک فرد کے لئے "مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ اسے ان جملہ علوم پر کامل دستگاہ حاصل ہو۔ اسے چند ایک علوم پر عبور اور دیگر علوم کی مبادیات سے واقفیت تو ہو سکتی ہے' وہ جملہ علوم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ بنا بریں، قرآنی حقائق کا کماحقہ ادراک، ایک فرد کا نہیں، ایک جماعت کا کام ہے۔ لہٰذا کسی فرد کو بھی اس کا دعوے نہیں ہو سکتا کہ قرآنی حقائق کے متعلق اس نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔

دوسرے یہ کہ خود علمِ انسانی کی کیفیت یہ ہے کہ جوں جوں حقائقِ کائنات منکشف ہوتے جاتے ہیں ان علوم کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ جوں جوں علمِ انسانی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، قرآنی حقائق نکھر اور ابھر کر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں خود قرآن کریم نے کہا ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ - (۴۱/۵۳)

ہم خارجی کائنات اور خود انسانی دنیا میں انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے

تاآنکہ قرآن کا ہر دعوے حقیقت بن کر ان کے سامنے آجائے۔

اس سے واضح ہے کہ جوں جوں انفس و آفاق کے حقائقِ مستور بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآن کی صداقتیں مشہود ہوتی چلی جائیں گی۔ لہٰذا انسانی تاریخ کے کسی دور میں بھی یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ قرآنی حقائق کے متعلق جو

کچھ سمجھا جاتا تھا وہ سمجھا جا چکا ہے۔ اس میں نہ اصلاح و ترمیم ہو سکتی ہے نہ حک و اضافہ ـــ جس طرح علومِ سائنس کے متعلق ریڈنگ یونیورسٹی کے طبیعات کے پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ نے کہا ہے کہ۔

دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے

اسی طرح، قرآنی حقائق کے متعلق بھی بجا طور پر کہا جائے گا کہ اس ضمن میں

حرفِ آخر، آخری انسان کے حصے ہی میں آسکتا ہے۔

یہ وجہ ہے کہ میں نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا کہ قرآنِ کریم کے متعلق جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ حرفِ آخر ہے اور اس میں سہو و خطا کا کوئی دخل نہیں۔ یہ اِفہام و تفہیمِ قرآنی کی بہرحال ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہے۔

میں اسے پھر دہرا دوں کہ میں نے جو ابھی عرض کیا ہے کہ قرآنی حقائق کو ہر دور کے انسانی علم کی سطح تک سمجھا جا سکتا ہے، تو یہ اُن حقائق کے متعلق ہے جنہیں قرآنِ کریم نے اپنے دعاوی کی تائید میں استعارات کے انداز میں بیان کیا ہے ـــ جس کتاب کو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہونا تھا اس کے حقائق کو تشبیہات و استعارات کے انداز ہی میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک، انسانی زندگی کے لئے راہ نمائی کا تعلق ہے، اسے قرآن نے متعین انداز میں بیان کر دیا ہے جس میں نہ ابہام ہے نہ اختلاف۔ وہ نہایت واضح، متعین، اور صاف و سادہ ہے جس سے نہایت آسانی سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔

جہاں تک قوانین کا تعلق ہے، قرآن نے بجز چند احکام، باقی قوانین کے لئے صرف اصول دیئے ہیں اور اسے ہر دور کی ملّتِ اسلامیہ پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین مرتب کرے۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کی حدود کے اندر مرتب کردہ جزئی قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ یہ قوانین اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہوں گے۔ اسی کو اسلامی فقہ یا شریعت کہا جاتا ہے۔ قرآنی مملکت میں کسی فرد یا افراد کی کسی جماعت کو حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ فقہی قوانین مرتب یا نافذ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت کا تصور ہی نہیں۔ مسلمانوں میں یہ تصور، ان کے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے جب دین نے مذہب کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے بنا دیئے گئے تھے۔

اِن غیر متبدل اصولوں کو، قرآنِ کریم نے اقدار (VALUES) سے تعبیر کیا ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷:۱) ہم نے اسے اس دور میں، جب دنیا آسمانی روشنی سے محروم ہو چکی تھی، نئی اقدار کا حامل بنا کر نازل کیا۔ غور فرمایئے عزیزانِ من! کہ قرآنِ کریم نے اس ایک لفظ (قدر)

میں کتنے عظیم حقائق کی دنیا سمٹا کر رکھ دی ہے۔ حیوان اور انسان میں امتیازی خط، قدر (VALUES) کا تصور ہے۔ حیوان صرف اپنی طبیعی ضروریات کا احساس رکھتا ہے۔ وہ اقدار (VALUES) کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ یہ انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ طبیعی ضروریات کا بھی احساس کرتا ہے اور اقدار کا تصور رکھنے کے قابل بھی ہے۔ جب کسی معاشرہ میں اقدار کا تصور گم ہو جائے یا مدھم پڑ جائے، تو وہ معاشرہ انسانوں کی بستی نہیں رہتا۔ حیوانات کا ہجوم بن کر رہ جاتا ہے جہاں صرف جنگل کے قانون کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اپنے احکام کی طرح ان اصول و اقدار کو بھی نہایت واضح اور متعین انداز میں بیان کیا ہے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا ابہام و اختلاف نہ رہے۔ انہیں ہر شخص جو قرآن کی زبان سے واقف ہو، بادنیٰ غور و تدبر، نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

لیکن "قرآن فہمی" کے سلسلہ میں، ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جو "پل صراط" کے عوامی تصور کے مطابق "بال سے باریک اور تلوار سے تیز" ہوتا ہے کہ وہاں سے اگر پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے گڑھوں میں جا گرے۔ وہ نازک ترین مرحلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خاص نظریہ یا تصور کو ذہن میں لے کر قرآن کی طرف صرف اس لئے آتا ہے کہ اُسے اس سے اپنے نظریہ یا تصور کی تائید مل جائے، تو اسے قرآن کی بارگاہ سے ایسی پھٹکار پڑتی ہے جو اُس کے لئے ہر دو جہان میں وجہ رسوائی ہوتی ہے۔ قرآن کو اپنے خیالات کے تابع رکھنا شرکِ عظیم ہے۔ یہ اپنا دروازہ اُس کے لئے کھولتا ہے جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ، خالی الذہن ہو کر اس کے آستانِ عالیہ پر دستک دے۔ ہمارا قدامت پرست طبقہ، ماڈرن مسلمانوں کو یہ کہہ کر مطعون کرتا ہے کہ یہ مغرب کے نظریات کو ذہن میں رکھ کر قرآن سے ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ یہ ان تمام نظریات و معتقدات کو جن کی سند صرف اس قدر ہے کہ وہ قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں، ایمان کا درجہ دے کر، قرآن کو ان کی تائید میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر ماڈرن طبقہ کا یہ جرم ہے کہ وہ اپنے ذہن میں پہلے سے کچھ تصورات قائم کر کے قرآن کی طرف آتے ہیں، تو ہمارا یہ اسلاف پرست طبقہ اس جرم کا ان سے بھی زیادہ شدت سے مرتکب ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ ؎

مکتب و ملا و اسرار کتاب
کور مادر زاد و نور آفتاب

تو اس سے یہی مقصود تھا۔ ماڈرن طبقہ تو پھر بھی کوئی ایک آدھ نظریہ مستعار لے کر قرآن کی طرف آتا ہوگا، یہ حضرات، زندگی کے اصولوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی جزئیات، ہر باب میں، متعین معتقدات اپنے ذہن میں رکھتے ہیں جن میں ذرا سی تبدیلی بھی کفر کے مرادف سمجھی جاتی ہے۔ اور پھر دعوے یہ کرتے ہیں کہ ہم قرآن میں

تدبر کرتے ہیں۔ سوچئے کہ جو اس طرح آنکھیں بند کر کے چلے، اسے سورج کی روشنی کیا فائدہ دے سکتی ہے؟

میں، برادرانِ عزیز! پوری دیانتداری سے عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میں نے قرآن کریم کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ میں اسے شرک سمجھتا ہوں۔ جہاں تک متوارث نظریات کا تعلق ہے انہیں میں نے اس زمانے میں قرآن کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا تھا جب میں قدامت پرستی کے ظلمتکدوں سے عقل و فکر کی وادیوں کی طرف آیا تھا۔ اور جہاں تک عصرِ حاضر کے پیدا کردہ نظریات کا تعلق ہے، ان میں سے ایک ایک کو میں نے ہدفِ تنقید بنایا اور قرآن کی روشنی میں پرکھا ہے۔ لہٰذا میرے فہم قرآنی میں کہیں غیر شعوری طور پر میرے خیالات کی آمیزش ہو گئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن میں نے دانستہ کبھی ایسا نہیں کیا، یہ اس لئے کہ اس کے لئے میں اپنے آپ کو خدا کے ہاں جواب دہ سمجھتا ہوں۔ ذمہ داری کا یہی شدید احساس ہے جس سے میری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ میں قرآن کے متعلق جب بھی کچھ کہنے کے لئے لب کشائی کرتا، یا کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا ہوں، تو میرا دل لرز جاتا ہے، میری روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

یہ کچھ تو عزیزانِ من! میں نے اپنے متعلق کہا۔ آپ احباب جس التزام سے میرے درس میں شریک ہوتے رہے اور جس جذب و انہماک سے اسے سنتے رہے ہیں، وہ قرآن کے ساتھ آپ کی والہانہ وابستگی کی دلیل ہے اور اس کے لئے آپ مستحقِ ہزار تبریک و تہنیت ہیں لیکن اس سلسلہ میں وہ بنیادی نکتہ جسے میں اکثر اپنے درس میں بیان کیا کرتا ہوں، اسے آج پھر دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی تعلیم صرف نہاں خانہ ذہن میں محفوظ کر لینے کے لئے نہیں۔ اس کا صحیح مقام، قلب انسانی کی گہرائیاں ہیں۔ اس لئے کہ ذہنی سطح پر تیرنے والی تعلیم، ایک قسم کا فکری نشاط تو پیدا کر سکتی ہے، انسان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہ ہو، جب تک اس کی اقدار کے پیمانے نہ بدلیں، اس کی سیرت و کردار میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہٰ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور جب اس طرح قلب و نگاہ مسلمان ہو جائے تو پھر قرآن کے الفاظ میں، یہ زمین بدل جاتی ہے، یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے یہ صلاحیت تھی کہ وہ اس جہانِ مستعار کو بدل کر اس کی جگہ ایک نئی دنیا وجود میں لے آئے، اس میں آج بھی اس کی صلاحیت بدستور موجود ہے، اسلئے

کہ قانونِ کائنات نہ کبھی پرانا ہوتا ہے نہ فرسودہ ــــــ قرآن آج بھی یہ کچھ کر کے دکھا سکتا ہے کہ ؎

گر زمینی، آسماں سازد ترا
آنچہ حق میخواہد، آں سازد ترا
خستہ باشی! استوارت می کند
پختہ مثلِ کوہسارت می کند
نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رحمۃً للعالمیں

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ - (۱۷/۹)

ـــــــــ (۰) ـــــــــ

آخر میں، میں اس سلسلۂ درازکی تکمیل پر ایک بار پھر بحضور رب العزت سجدہ ریز ہوں کہ اس نے مجھے ان صبر آزما مراحل کو بہ حسن و خوبی طے کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اور اس کے ساتھ ہی بصد عجز و نیاز عرض پرداز کہ اس درس میں میں نے جو کچھ قرآن کی منشاء کے مطابق پیش کیا ہے، وہ اسے ثبات و استحکام عطا کرے، اور اگر کوئی بات، نادانستہ، منشائے قرآنی کے خلاف کہہ دی گئی ہو، تو اسے محو کر دے۔ اقبالؒ کی ہم نوائی میں میری دعا یہ ہے کہ ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن!

اور ــــ

گر دُرِ اسرارِ قرآں سُفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

والسلام علیکم!

جشنِ تکمیل درسِ قرآن

میں نے قرآن سے کیا پایا

عزیزہ نبسم ضیاء۔ طالبہ جماعت ہشتم ڈسکہ

میرے بزرگو، بھائیو اور بہنو! — السلام علیکم!

میری تقریر کا عنوان ہے "میں نے قرآن سے کیا پایا" — میں چھوٹی سی تھی۔ اب بھی تو کچھ بڑی نہیں ہوں۔ لیکن اس وقت میری عمر یہی کوئی چھ سات برس کی ہوگی۔ ہمارے پڑوس میں ایک گھر تھا۔ وہاں میری سہیلیاں تھیں۔ میں ان کے ساتھ کھیلنے کے لئے ان کے ہاں جایا کرتی تھی۔ وہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ تھے ویسے بھی خوشحال گھرانا تھا۔ میری سہیلیاں تین بہنیں تھیں۔ بھائی ان کا کوئی نہیں تھا۔ ایسے پڑھے لکھے اور خوشحال گھرانے کی بچیوں کو پھولوں کی طرح شاداب اور ستاروں کی طرح درخشندہ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ لڑکیاں ہمیشہ پژمردہ اور افسردہ سی رہتیں۔ اداس اداس سے چہرے، خاموش خاموش سی نگاہیں، مجھے مجھے سے دل، اڑی اڑی سی رنگت، دبی اور سہمی ہوئیں۔ کوئی اجنبی دیکھے تو یہی کہے کہ کسی یتیم خانے کی لاوارث بچیاں ہیں۔ ان کی حالت ایسی کیوں تھی؟ اس کی وجہ نہ میری سمجھ میں آسکتی تھی۔ نہ ہی وہ کچھ بتا سکتیں۔ ایک دن میں ان کے ہاں گئی تو دیکھا کہ سارا گھر بے حد اداس ہے اور فضا پر مُردنی چھائی ہوئی ہے۔ میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگ گیا۔ میں نے سمجھا کہ اُن کے ہاں کوئی مرگ ہوگئی ہے۔ میری سہیلی کمرے سے صحن میں آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اُسے ایک طرف لے گئی تو اس نے کہا کہ میری امی رو رہی تھی، میں بھی رونے لگ گئی۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیوں رو رہی ہیں۔ اس نے کہا کہ میرے ابا جان امی سے کہتے تھے کہ تم بڑی منحوس ہو۔ تمہارے ہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگر اب کے بھی لڑکی پیدا ہوئی تو میں تمہیں گھر سے نکال دوں گا۔ آج صبح امی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تمہاری ایک اور بہن آگئی ہے اور یہ کہہ کر میری امی زار و قطار رونے لگ گئی اور میں بھی رونے لگ گئی۔ یہ میرے لئے ایک اور معمہ تھا۔

انہی دنوں ایک مولوی صاحب ان بچیوں کو قرآن شریف پڑھانے آیا کرتے تھے۔ وہ انہیں قرآن تو ناظرہ

پڑھاتے لیکن اس کے ساتھ ہی دینِ اسلام کی بہت سی باتیں بھی بتاتے جنہیں میں بھی اکثر سنا کرتی ۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ میاں نے اماں حوّا کو بابا آدم کی پسلی سے پیدا کیا تھا اور چونکہ پسلی کی ہڈی ٹیڑھی ہوتی ہے اسلئے عورت بھی بڑی ٹیڑھی کھوپری کی ہوتی ہے۔ پھر وہ بتاتے کہ اماں حوّا نے شیطان کے فریب میں آکر بابا آدم کو بہکا دیا تھا جس کی وجہ سے وہ جنت سے نکال دیئے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کو منحوس تصوّر کیا جاتا ہے پھر وہ یہ بھی بتلاتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دوزخ میں سب سے زیادہ عورتیں ہوں گی ۔

ان باتوں کا میرے ننھے سے دل پر بڑا اثر پڑتا ۔ اس لئے میں بھی اداس اداس سی رہنے لگ گئی ۔ اور اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ میری سہیلیاں اس قدر افسردہ اور مغموم کیوں رہتی تھیں ۔ اور ان کی چوتھی بہن کے آنے پر ان کی امّی کیوں روتی تھی ۔ ان باتوں کا مجھ پر اثر تو ضرور ہوتا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی سوچا کرتی کہ اگر عورت واقعی ٹیڑھی کھوپڑی کی اور منحوس ہوتی ہے تو اللہ میاں نے مجھے لڑکی کیوں بنا دیا ۔ میں نے نہ تو اللہ میاں سے کہا تھا کہ مجھے لڑکی بنا دیجئے اور نہ ہی میں نے کوئی ایسا قصور کیا تھا جس کی سزا دینے کے لئے مجھے ایسا بنا دیا گیا ہو ۔ میرا دل ان سوالات کا کوئی جواب نہ دیتا اور نہ ہی میں اس ڈر سے کہ اللہ میاں کہیں ناراض ہو کر بیٹھے نہ لگ جائیں ، کسی سے یہ باتیں ہی کرتی ۔

اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر اپنے گھر میں ہم بھی چند سالوں کے بعد چار بہنیں ہو گئیں ۔ بھائی ہمارا بھی کوئی نہ تھا ۔ لیکن ہمارے گھر کا نقشہ ہی کچھ اور تھا ۔ خدا کے فضل سے ہمارے تو گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی ۔ ابّا اور امّی ہم سے اتنا پیار کرتے کہ ان کی گود میں ہم مسرّتوں کے جھولے جھولتیں اور ستاروں سے آنکھ مچولی کھیلتیں ۔ ماں باپ کی اس شفقت کی وجہ سے ہم چاروں بہنوں میں اس قدر باہمی محبت تھی کہ ہمیں سہیلیوں کی تلاش میں کہیں باہر نہیں جانا پڑتا تھا ۔ میں جب اپنے گھر کا مقابلہ اپنی سہیلیوں کے گھر سے کرتی تو دل میں کہتی کہ ہم تو اس بابا آدم اور دادی حوّا کی اولاد نہیں ہو سکتیں جن کا تذکرہ وہ مولوی صاحب کیا کرتے تھے ۔

میں جب ذرا بڑی ہوئی تو میں نے اپنے ابّا جی سے اپنی سہیلیوں اور مولوی صاحب کے وعظ کا ذکر کیا ۔ اور ان سے پوچھا کہ ہمارے گھر میں اور ان کے گھر میں ایسا فرق کیوں ہے ؟ ابّا جی نے مجھے بتایا کہ بیٹی ! ہم قرآن شریف کی تعلیم کے مطابق چلتے ہیں اور اس کی تعلیم یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے میں کوئی فرق نہیں ۔ عورت اور مرد یکساں عزت کے مستحق ہیں ۔ نہ عورت بابا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے مرد کو بہکا کر جنت سے نکلوایا تھا ۔ میں نے ان سے کہا کہ ابّا جان ! وہ مولوی صاحب بھی تو قرآن شریف ہی پڑھایا کرتے تھے ۔ پھر وہ ایسی باتیں کیوں کرتے تھے ۔ انہوں نے کہا کہ وہ قرآن شریف کو صرف پڑھتے تھے ، اسے سمجھتے نہیں تھے ۔ ہم قرآن شریف

کو سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے قرآن شریف کو اس طرح سمجھ کر پڑھنا کہاں سے سیکھا ہے۔ انہوں نے کہا۔ بیٹی! لاہور میں ہمارے ایک بابا جی رہتے ہیں۔ وہ اس طرح قرآن شریف کو سمجھاتے ہیں۔ یہ طلوع اسلام انہی کا رسالہ ہے۔ یہ اتنی ساری کتابیں جو تم میری الماری میں دیکھتی ہو، سب انہی کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں انہوں نے قرآن شریف کو سمجھایا ہے۔ یہ انہی کی برکت ہے کہ ہمارا گھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا ہے۔ اور تم بچیاں ہمیں ہزار بیٹوں سے بھی عزیز تر ہو۔ اس پر میرے دل میں ان بابا جی کو دیکھنے کا بڑا شوق پیدا ہوا۔ میں نے ابا جی سے کہا کہ ایک دن ہمیں ان کے پاس لے چلئے۔ چنانچہ ہم سب بہنیں بابا جی سے ملنے کے لئے آئیں۔ انہوں نے ہمیں ایسی محبت سے گلے لگایا کہ میں نے محسوس کیا کہ جس بابا آدم کی ہم اولاد ہیں وہ ضرور اسی قسم کے ہوں گے۔

سو میرے بزرگو، بھائیو اور بہنو! اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ مجھے درس قرآن سے کیا ملا تو میں تو اتنا ہی کہہ سکوں گی کہ مجھے یہاں سے ایک نیا بابا آدم مل گیا جس کی اولاد میں مرد اور عورت یکساں عزت اور تعظیم کے مستحق ہیں۔ جو دنیا میں اس لئے آیا ہے کہ جن بچیوں کو انسانوں کی جہالت اور حقارت نے زندہ قبروں میں دبا دیا تھا، انہیں قرآن کی روشنی میں ان قبروں سے نکال کر زندہ انسانوں کی صف میں کھڑا کر دے۔

کتنا بڑا احسان ہے اس بابا کا ہم بچیوں پر ——— میں دعا کرتی ہوں آپ آمین کہیئے۔ کہ خدا ہمارے اس محسن کو تادیر سلامت رکھے۔

والسلام!

جشنِ تکمیلِ درسِ قرآن

میں نے اس درس سے کیا پایا

(محترم فرید الدین۔ متعلم۔ بی۔ اے)

اتوار کا دن تھا۔ میرا دوستوں کے ساتھ کشتی رانی کا پروگرام تھا۔ سارا ضروری سامان ٹوکری میں بھر چکا تھا۔ اور جلدی جلدی کپڑے بدل رہا تھا تاکہ دوستوں کے آنے سے پہلے بالکل تیار ہو جاؤں۔ ابھی پلنگ کے نیچے اپنا ایک جوتا تلاش کر ہی رہا تھا کہ ابا جان کمرے میں آ گئے۔ کہنے لگے، چلو اچھا ہوا تم تیار ہی ہو۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔

میں ایک دم ہونچکا رہ گیا۔ پھر میں نے ان کو بتایا کہ آج میرے آٹھ عدد دوست یہاں آ رہے ہیں اور پھر ہم سب راوی جائیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ میری اس بات کے بعد وہ مجھے کہیں نہیں لے جائیں گے کیونکہ

وہ میرے تفریح کے پروگراموں میں ہمیشہ بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن اس دن انہوں نے تفریح کے پروگرام سے باخبر ہو کر بھی کہا کہ مجھے ان کے ساتھ جانا ہوگا۔ چنانچہ میں سمجھ گیا کہ یقیناً کوئی اہم بات ہوگی میں نے دوستوں کے نام ایک معذرتی رقعہ گھر کے دروازے پر لٹکایا اور اباجان کے ساتھ ہولیا۔ میرے کئی مرتبہ پوچھنے پر بھی انہوں نے نہیں بتایا کہ جانا کہاں ہے۔

راستے میں وہ کہنے لگے کہ اب تم دسویں کے امتحان سے فارغ ہوگئے ہو، میں نے کچھ کتابیں تمہارے لئے منتخب کی ہیں جو تمہیں نتیجہ آنے سے پہلے پہلے ختم کرنی ہیں۔

میں نے کہا۔ اچھا! لیکن وہ ہیں کس قسم کی؟

کہنے لگے۔ واپس آکر خود دیکھ لینا۔ اس کے بعد انہوں نے برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے نام پر اٹھنے والی مختلف تحریکوں کا ذکر شروع کر دیا۔ پھر کسی کا نام لئے بغیر اسلام اور اس کے نظام سے متعلق مختلف مکاتیب فکر کا تعارف کرایا۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ بتاؤ تم اس میں سے کس کس طرزِ فکر سے متفق ہو اور کس کس سے اختلاف ہے؟ میں نے کچھ کو تو بالکل رد کر دیا، کچھ کو احمقانہ اور ناقابلِ عمل قرار دیا۔ لیکن چند کو جزوی اور چند کو بہت اچھا قرار دیا۔ میں نے دیکھا کہ اباجان میرے انتخاب پر خاصے مطمئن تھے۔ پھر انہوں نے کہا کہ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم معلوم کر کے مجھے یہ بتاؤ کہ جتنے مکاتیبِ فکر کا تذکرہ میں نے ابھی ابھی کیا ہے، اُن کا بانی کون کون ہے؟

کچھ کے بارے میں تو میں سمجھ گیا تھا جن کے نام میں نے فوراً بتا دیئے، لیکن کچھ کے بارے میں شبہ تھا، یا لاعلم تھا۔ چنانچہ بعد تحقیق و تفتیش بتانے کا وعدہ کر لیا۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم ایک پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے۔ اباجان نے مجھ سے کہا۔ تمہیں یاد ہے جب تم اسکول میں خود ساختہ شرارتیں کرنے کے قابل ہو گئے تھے تو میں نے تمہیں ہر نئے نظریئے کو قبول کرنے سے پہلے ایک اصول پر عمل کرنے کی تاکید کی تھی۔

"اور وہ اصول یہ تھا" میں نے ان کی بات کو آگے بڑھایا۔ "کہ جب بھی کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ میرے سامنے آئے تو اسے قبول یا رد کرنے سے پہلے، میں اس پر آپ سے تبادلۂ خیال کر لوں۔ پھر جس کے دلائل وزنی ہوں اسی کی رائے کے مطابق اس نئے نظریئے کو قبول یا رد کر دیا جاتا ہے"۔ مجھے یہ اصول اچھی طرح یاد ہے اور میں نے ہمیشہ اس پر پوری طرح عمل کیا ہے۔

اباجان نے کہا۔ ٹھیک ہے لیکن اب تم جس دروازے میں داخل ہونے والے ہو، وہ اس اصول سے مستثنیٰ ہے۔ یہاں ایک صاحب درسِ قرآن دیتے ہیں۔ تم یہاں جو کچھ بھی سنو، اگر وہ تمہیں قرآن کریم کے

مطابق نظر آئے اور تمہاری عقل اس پر صاد کرے، تو میرے مشورے کے بغیر تم اسے قبول کر سکتے ہو۔

میں سخت حیران تھا کہ وہ کون مولوی صاحب ہیں جن پر ابا جان کو اتنا اعتماد ہے کہ بغیر سنسر کئے میں ہر بات تسلیم کر سکتا ہوں۔ قبل اس کے کہ میں مولوی صاحب کا نام پوچھتا، انہوں نے بتایا کہ یہاں پرویز صاحب درس دیتے ہیں۔

مجھے ایک دم ایک دھچکا سا لگا ——— پرویز صاحب؟

ارے وہ پرویز ——— اور اس کے ساتھ ہی پرویز صاحب کے متعلق تمام مشہور باتیں اور تعریفیں میرے ذہن میں اجاگر ہو گئیں۔ اور پھر فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا کہ ابا جان نے یہاں کی باتوں کو ان کے مشورے کے بغیر قبول یا رد کرنے کی آزادی مجھے اسی لئے دی تھی کہ یہاں کی سب باتیں ہی عقل کے اتنے خلاف ہوں گی کہ میں خود ہی بلا تامل انہیں رد کر دونگا۔ قبول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔

لیکن ابھی راستے میں جس نظریے کو تم نے سب سے زیادہ سراہا تھا، وہ انہی پرویز صاحب کا تھا، ابا جان نے بڑے اطمینان سے مجھے بتایا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ اور بولوں، وہ مجھے اس دروازے سے اندر لے آئے۔

یہاں پہنچ کر میں نے عجیب منظر دیکھا۔ اچھے خاصے معقول اور سنجیدہ قسم کے لوگ اسی پرویز کا درس قرآن سننے کے لئے بڑی لگن سے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پھر جو بات مجھے فوراً ہی کھٹکی، وہ یہ تھی کہ درس قرآن کی اس محفل میں، اسٹیج کے بالکل سامنے کچھ خواتین بھی بیٹھی تھیں۔ ان کے وہاں بیٹھنے سے زیادہ عجیب بات مجھے لگ رہی تھی کہ وہ خاموش بیٹھی تھیں۔ کیونکہ وعظ اور درس میں نے پہلے بھی دیکھے اور سنے تھے جہاں پردے کے پیچھے ہمیشہ مسلسل چھالیہ کترنے، بچوں کے رونے اور خواتین کے آپس میں ضروری تبادلہ خیالات کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہاں اس شور کے بغیر روایتی درس کا سماں کیسے بندھے گا؟ ——— بہرحال یہ ماحول مجھے کچھ متاثر کن لگا کیونکہ اس کی متانت میں اصل اسلام کے مزاج کی جھلک تھی۔

پھر میں نے اس اسٹیج کا بغور جائزہ لیا جو میرے لئے بالکل انوکھا تھا۔ لکڑی کے ایک چوکور بے رنگ تخت پر ایک لمبا چوڑا بھاری بھرکم نہایت گداز قسم کا صوفہ رکھا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ آدمی اس میں گردن تک تو ضرور دھنس جاتا ہو گا۔ ابھی میں اس کے وزن کا اندازہ کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے کچھ لوگوں کی توجہ ایک طرف ہوتے دیکھی۔ میں نے ادھر دیکھا تو ایک دروازے میں سے ایک شخص مسکراتا ہوا آرہا تھا، ہاتھوں میں ایک تولیہ اور دو موٹی موٹی سی کتابیں تھیں۔ وہ لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا، ان سے

متکبرانہ انداز میں علیک سلیک کرتا ہوا چلا آرہا تھا۔ مجھے اس شخص کی چال، مزاج پرسی اور سلام دعا کے انداز میں ایک عجیب طرح کی شفقت اور بزرگانہ شان نظر آئی جس میں غرور کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا۔ یہ تو کوئی بہت ہی نیک اور بزرگ آدمی معلوم ہوتے ہیں، جن کا آپ ہی آپ احترام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پتہ نہیں، یہاں کہاں سے آپھنسے بیچارے۔ اللہ رحم کرے' ان کا دین و ایمان سلامت رکھے۔

لیکن پھر میں دیکھتا کیا ہوں کہ وہی صاحب سیدھے اس اسٹیج کے پاس پہنچے، چپل تخت پر اتارے اور آرام سے صوفے پر بیٹھ گئے۔

میں ششدر رہ گیا۔ یہ ہیں وہ پرویز صاحب؟ ––– اسے منکرانِ کی تو ڈاڑھی بھی نہیں ہے یہ درس قرآن کیسے دیں گے؟ اور میں نے انجانے میں انکی پتہ نہیں کیا کیا تعریفیں کر دیں ––– لاحول ولا قوۃ!

اس کے بعد درس شروع ہوا۔ اور میں اونگھنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کیونکہ اس سے پہلے جتنے بھی درس سنے تھے ان میں مجھے نیند سے باقاعدہ کشتی لڑنی پڑی تھی۔ کیونکہ اکثر باتیں غیر متعلق اور اوپری اوپری سی ہوتی تھیں۔ دماغ انہیں سننے سے بچنے کے لئے نیند کو بلا بھیجتا تھا۔

لیکن یہاں معاملہ ہی اور ہوا۔ تھوڑی دیر بعد میرے دماغ کے رہے سہے خوابیدہ گوشے بھی بیدار ہونے شروع ہو گئے، کیونکہ ہر بات میں ایک جان تھی، اور تخاطب مدلل۔ میرے گوشِ ہوش جاگتے۔ نتیجہ یہ کہ ڈیڑھ گھنٹے کے اس درس میں اونگھنا تو درکنار پلک بھی مشکل سے جھپکی ہوگی۔

اور اب میں اس سوچ میں تھا کہ اس سے قبل میں اس تعمیری قسم کے درس سے کیوں محروم رہتا رہا؟ بالخصوص قرآن کے معاشی نظام کی وضاحت نے تو مجھے بے حد متاثر کیا۔ اور یہ وہ پہلی چیز تھی جو میں نے درس سے حاصل کی۔

اس درس سے دوسری چیز جو میں نے حاصل کی وہ قرآن کے مزاج کا صحیح اور واضح تصور تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ قرآنی فکر جس شخص کے رگ و ریشہ میں بس جاتی ہے اس میں کیسی شفقت، حلیمی اور متانت پیدا ہو جاتی ہے اور غرور و نخوت کس طرح جڑ سے ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عام آدمیوں سے الگ تھلگ کوئی اور مخلوق نہیں سمجھتا بلکہ بڑی محبت سے انہیں قرآن کے حقائق سمجھاتا ہے جس طرح ایک شفیق بھائی یا ایک عزیز دوست دوسرے کو سمجھاتا ہے۔ وہ ہر وقت اس بات کو یاد رکھتا ہے کہ بھول اس سے بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہر بات سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور اگر سہواً کوئی غلطی ہو جاتی ہے اور کوئی اس کی نشاندہی کر دے تو اس کو اپنی کسرِ شان نہیں سمجھتا۔ بلکہ کوتاہی سے باخبر کرنے والے کا شکر گذار ہوتا ہے۔

تیسرا احساس جو مجھے اس درس سے ہوا وہ یہ تھا کہ چودہ سو سال سے میرا جو سرمایہ حیات مجھ سے چھینا

ہوا تھا وہ مجھے واپس مل گیا۔ میری مثال شیر کے اس بچے کی طرح تھی جسے بھیڑوں میں پالا گیا ہو۔ اس کی جبلت تو ایک خاص سمت زور کر رہی ہو اور وہ ایک نامعلوم بےچینی کا شکار ہو۔ لیکن یہ نہ جانتا ہو کہ وہ چاہتا کیا ہے اور پھر جب ایک اپنا اور ایک دوسرے شیر کا عکس پانی میں یکساں دیکھے تو فوراً اپنے آپ کو پہچان کر اپنی اصلیت کی طرف لوٹنے کیلئے بےقرار ہو جائے۔ اور اس کی تمام خوابیدہ اور فریب خوردہ خصوصیات اور صلاحیتیں از سرِ نو اجاگر ہونے لگیں ـــــ قرآن، جو پہلے مجھ سے بہت اونچا الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں لپٹا لپٹایا رکھا تھا، اور محض بےچین روحوں کو جھوٹی تسلی دینے کا ذریعہ بن کے رہ گیا تھا، اب مشعل بن کر اس طرح میرے ہاتھ میں آگیا کہ زندگی کی راہ کا ہر گوشہ منور ہونا شروع ہو گیا۔ اور اس طرح چودہ سو سال بعد میں نے اپنا قرآن دوبارہ پالیا۔

چوتھی اور بہت اہم بات جو میں نے یہاں پائی، وہ یہ تھی کہ "خدا پر ایمان بالکل لایعنی اور فضول بات ہے جب تک یہ بات واضح نہ ہو کہ ایمان کس قسم کے خدا پر ہے اور اس کی خصوصیات اور صفات کیا ہیں؟' کیونکہ انسانی ذات کی نشوونما کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس میں صفاتِ خداوندی حدودِ بشریت کے اندر اندر زیادہ سے زیادہ پیدا ہوتی چلی جائیں۔ اور وہ جب ہی ہو سکتی ہیں جب انسان کو ان کا پوری طرح علم ہو ـــــ اور پھر اس تصور نے میرے اندر یہ جذبہ بیدار کیا کہ میں بلاتمیز رنگ و نسل دنیا میں نوعِ انسانی کے لئے بھلائی اور خوشگواریاں پھیلاتا چلا جاؤں کہ یہ صفتِ خداوندی ہے اور اسی سے دنیا بھی سنورتی ہے اور آخرت بھی۔

اور پانچویں چیز جو اس درس سے ... ... مگر ذرا ٹھہریئے۔ پہلے آپ مجھے یہ بتایئے کہ جب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ خدا کا صحیح تصور میں نے اس درس میں پالیا، قرآن کا اصل مفہوم میں نے اس درس میں پالیا، قرآن کا مزاج میں نے اس درس میں پالیا ـــــ تو کیا ابھی کوئی اور ایسی چیز رہ گئی ہے جو میں نے نہیں پائی؟ کیا کائنات میں کوئی ایسی چیز ہے، جو صفاتِ خداوندی سے باہر ہو؟ یا زندگی کا کوئی ایسا گوشہ ہے، جو قرآن کی زد میں نہ ہو؟ ـــــ یا ضروریاتِ انسانی کا کوئی مسئلہ ہے جو قرآن کے معاشی نظام سے باہر ہو؟ ـــــ یا گردشِ وقت کا کوئی ایسا تیور ہے، جسے قرآن کا مزاج درست نہ کر دے؟

دراصل یہ پوچھنا چاہیئے ہی نہیں کہ میں نے اس درس سے کیا کیا پایا؟ پوچھنا یہ چاہیئے کہ میں نے اس درس سے کیا کیا نہیں پایا؟ تاکہ ہر شخص آسانی سے کہہ سکے کہ الحمد للہ میں نے سب کچھ پایا۔

اور اگر آپ جو کچھ میں نے پایا ہے اس کی تفصیلات جاننے کے بہت ہی مشتاق ہیں، تو نسخہ میں بتا دیتا ہوں، عمل آپ کر لیجئے ـــــ قرآن کریم کا ایک نسخہ لیجئے، اور سلیم دل سے بغور اول سے آخر تک پڑھ جایئے۔ بس جو کچھ آپ کو اس میں ملے، وہی میں نے پایا ہے۔

محترم خواتین و حضرات! اب میں آپ سے اپنی ایک شدید ذہنی الجھن کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ الجھن مجھے اس وقت سے ہے جب سے "جشنِ ختمِ قرآن" کا اعلان ہوا ہے۔ خدا مجھے معاف کرے کیا یہ قرآن کوئی بوجھ تھا جو ہمارے سر سے اتارے نہیں اتر رہا تھا؟ اور اب اتر گیا ہے تو ہمیں ہری ہی ہری سوجھنے لگیں؟

آخری درس میں میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح یہ ڈیڑھ گھنٹہ پھیل کر میری پوری زندگی پر محیط ہو جائے اور جب درس ختم ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میری زندگی بغیر روح کے رہ گئی۔ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اس روح کی پرواز کا جشن ہونا چاہیئے۔ ہمارا کوئی عزیز رخصت ہوتا ہے تو ہم دعوت تو ضرور کرتے ہیں لیکن اسے الوداعی دعوت کہتے ہیں۔ اور اس میں ہمارے منہ ہاتھ ہاتھ بھر لمبے ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارا جان سے عزیز درس رخصت ہو گیا تو ہم جشن منا رہے ہیں۔ کیا ہر درس ہمارے لئے جشن سے کم تھا؟

بہت سوچا مگر یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر دل کو اس طرح تسلی دی کہ یہ تقریب تو دراصل ختم قرآن کی الوداعی دعوت ہے اور جشن ہے درسِ قرآن کے نئے سرے سے آغاز کا۔ جب قرآن ایک سدا بہار حقیقت ہے تو پھر اس کا درس بھی سدا بہار کیوں نہ ہو؟

یہی تصور میرے لئے اب کچھ ڈھارس کا باعث ہے۔ خدا کرے میری یہ خود فریبی حقیقت بن کر سامنے آجائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری ہی آواز نہیں، بہت سے اپنے ہی جیسے مضطرب قلوب کی دھڑکنوں کی آواز بھی ہے ـــ کیوں! ـــ فکرِ قرآنی کے علمبردار خواتین و حضرات' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟؟

＊

جشنِ تکمیلِ درسِ قرآن

میں نے درس سے کیا پایا

(محترم میاں ظفر احسن محمود صاحب، ایڈووکیٹ)

یہ سوال نظر بظاہر کس قدر سادہ، مختصر اور آسان لگتا ہے جواب سوچنے بیٹھئے تو ایک دہشت وا ہو جاتا ہے۔ ذہن کے شعور و لاشعور کی پیچ در پیچ تہیں ایک ایک کر کے کھلتی جاتی ہیں۔ مطالبِ قرآن کریم کے مرتب کردہ افراد اور نتائج کی سلسلہ در سلسلہ کڑیاں ہیں کہ عمیق سے عمیق تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کہنے کو تو یہ ڈیڑھ گھنٹہ کی

ایک مختصر نشست ہوتی تھی جو مہینے میں صرف چار بار آتی۔ لیکن اب جو اس کے نتائج و اثرات ڈھونڈنے نکلے ہیں تو یا حیرت! یا استعجاب۔ یہ سیدھے سادے مختصر سے الفاظ کس سرعت اور شدت سے تصورات اور افکار کی دنیا پر محیط و مستولی ہو چکے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں اتنی عظیم انشراحِ صدر۔ اللہ اکبر یہ صرف اعجازِ قرآن ہے۔

اب یہ داخلی نفسیاتی جائزہ لینا کہ درس میں حاضر ہونے سے قبل ہم کہاں تھے اور اب تکمیل درس قرآن کے بعد ہم نے کیا حاصل کیا ہے' بہت وقت طلب اور ضخامت خیز گفتگو ہوگی۔ آج کے مختصر مقالہ میں تو اشارۃً اُن نمایاں عناصر کی محض نشاندہی کر پاؤں گا جنہیں میں نے دنیائے علم و فن کا گنج گراں بہا پایا۔ اور جواب میرے خزینۂ قلب و نظر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو چکے ہیں۔

حاضرین کرام! غالباً آپ کو علم ہوگا کہ میں مدت العمر سے فلسفہ کا طالب علم اور ایک پیشہ ور قانون دان ہوں۔ یہ دو مکاتیبِ فکر اپنا اپنا منفرد مزاج رکھتے ہیں۔ میری ذاتی شخصیت بنیادی طور پر ان دونوں کے ایک متوازن امتزاج کا مظہر ہے۔

میں شروع ہی سے طبعاً تقلید سے متنفر تھا۔ اور میرے نزدیک ہر دور کا انسان گزشتہ زمانے کے انسان سے زیادہ ذہین، زیادہ عالم با خبر اور عقلی طور پر زیادہ تربیت یافتہ ہوتا ہے۔ اس کلیہ میں استثناء صرف دو ہیں۔ افرادِ بالغہ (GENIUS) اور صاحبانِ رسالت۔ ہر مسئلہ کا جواب اور ہر مشکل کا حل میں ہمیشہ عقل اور دلیل و برہان کی رُو سے جاننے کے لئے بیقرار رہتا تھا۔ علم حاصل کرنا اور پھر اُس کی کنہ و حقیقت کا انکشاف ہوئے بغیر کبھی مطمئن نہ ہونا ایک ایسی ذہنی نہج ہے جو علم فلسفہ اور علم قانون دونوں میں قدرِ مشترک ہے۔

خدا کی ذات، اُس کی ہستی، اس کی صفات، اُس کا تعلق ہمارے ساتھ، یہ، اور اس قسم کے ہزاروں سوال میرے لئے چیستان بن چکے تھے۔ اگر خدا کی ہستی کو تسلیم کرتا تو خدا کا ایک مبہم اور ناقابلِ تسلیم تصور سامنے آتا کہ سلسلہ در سلسلہ اور تہہ در تہہ سوالات اور شکوک و شبہات پیدا ہوتے کہ معرفتِ ذاتِ الٰہی تو ہو نہ پاتی مگر اپنی ہستی کے کلّی فقدان کا خطرہ البتہ نمایاں طور پر لاحق ہو جاتا۔ یہاں علمِ قانون کہتا کہ اس تحقیق و تدقیق میں کہیں کوئی بنیادی غلطی ہے، کوئی غلط مفروضہ ضرور ہے۔ اور اب جو خدا کی ہستی سے انکار کے متعلق سوچتا تو عدم وجودیتِ خالق بھی غیر منطقی اور ناقابلِ عمل مفروضہ نظر آتا۔

ATHEISM اور THEISM' میرے نزدیک دونوں ہی ذہنِ انسانی کے غیر منطقی تولیدہ افکار، اور مبہم، ناقابلِ فہم، داخلی تصورات کے بے ہنگم گڈمڈ کا بے ربط نتیجہ تھیں اور ہستیِ الٰہی کی علمی تفہیم اور اُن کا

عقلی ثبوت میرے نزدیک ناممکن بن چکے تھے۔ لیکن دوسری جانب اس مربوط نظامِ کائنات کا کسی فاطر و خالق کے بغیر محض تاریخی حادثہ کے طور پر وقوع پذیر ہو جانا بھی ناقابلِ یقین اور انتہائی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ بلکہ مؤخر الذکر دلیل تو مجھے اپنے ساتھ ایک گستاخ مذاق اور توہین آمیز فریب دکھائی دیتی۔ جو لوگ زندگی کے کسی موڑ پر اس طوفانِ کرب و بلا سے گزرے ہیں، بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں کس جانگسل اذیت میں مبتلا تھا۔

اسی درس سے مجھے آواز آئی: اب تم اطمینان سے بیٹھو، تمہاری مشقت انگیز مسافتیں ختم ہوئیں تم منزل پر آن پہنچے۔ ہوا یہ کہ اس درس نے مجھے خدا کے صحیح تصور سے آشنا کر دیا۔ اور دیکھتے چٹکیوں میں میری ساری الجھنیں، میرے سارے شکوک و شبہات اور تمام اعتراضات و ابہام ختم ہوتے۔ جس تصور کے وجود و عدمِ وجود کے متعلق میں غلطاں و پیچاں تھا، وہ تو دراصل سلطانِ جابر کا تصور تھا۔ اور ہماری نگاہ سطحی بین یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ یہ خدائے ذوالعرش کا تصور کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا کا صحیح تصور دینے کے لئے فی الواقع وحی کی ضرورت ہے جو ایک OBJECTIVE IMAGE دے سکے۔ جونہی درست تصور سامنے آتا ہے یہ صدیوں کی پرانی بحثیں اور نزاع دو گھڑی میں ختم ہو جاتی ہیں۔

دوسری طرف علم القانون میں انسانی معاشرہ میں اختیارِ اعلیٰ یعنی SOVEREIGNTY کا مسئلہ ہمیشہ سے میرے لئے مستقل دردِ سر بنا ہوا تھا۔ افلاطون سے ہیرلڈ لاسکی اور سی ایم ای جوڈ تک کا فلسفہ میرے پیشِ نظر تھا۔ جسٹینین سے لے کر اوپن ہائم تک سارے نظریات کی انتہائی کد و کاوش سے موشگافی بھی کر چکا تھا مگر یہ مسئلہ نہ حل ہونا تھا نہ ہوا۔ کوئی ایسا نظریہ سامنے نہ آیا جس کی صداقت کی عملی شہادت صفحاتِ تاریخ سے بھی ملتی۔ ہر نظریہ ذہنِ انسانی کے کسی ایک ارتقائی دور کی نشاندہی کرتا اور تاریخ شہادت دیتی کہ اس نظریہ کی صداقت اسی عہد کے عوامل و محرکات کے انحطاط کے ساتھ ساتھ زوال پذیر ہو گئی اور بالآخر وہ نظریہ خود بخود مرورِ زمانہ سے ہی باطل ثابت ہو گیا۔ بہرصورت یہ سوال فلسفۂ قانون میں ہمیشہ اصل اصول رہا کہ معاشرہ میں اختیارِ اعلیٰ کا مالک کون ہے۔

کیا سلطانِ جابر SOVEREIGN ہے یا کہ معاشرہ کا طاقتور ترین فرد؟ کیا اختیارِ اعلیٰ کی بنیاد کثرتِ دولت و زر ہو سکتی ہے یا کثرتِ جمعیت یعنی بڑا جتھہ، مذہبی پیشوا، مافوق الفطرت قوتوں کی نمائش کرنے والے جادوگر، یا انتہائی ذہین و فطین اور عالم یا خطیب، یا ایسے افراد پر مشتمل مختصر سا طائفہ حاملِ اختیارِ اعلیٰ ہو سکتے ہیں؟ کیا جمہوریت میں جمہور کو اختیارِ اعلیٰ حاصل ہے یا ان کی مقننہ کو، یا انتظامیہ کو یا عدلیہ کو یا کہ اختیارِ اعلیٰ صدر کو حاصل ہے؟ SOVEREIGNTY کا متعین ہونا اس لئے لابدی ہے کہ اس کے تعین کے بغیر مبادیاتِ قانون اور اس کے بنیادی تصورات وغیرہ کسی طور پر بھی

سطے نہیں ہو سکتے۔ قانون کی ان بنیادوں کے تحت علم و یقین کے بغیر اُن کی حکمیت، ہمہ گیریت اور افادیت پر ایمان نہیں آسکتا۔ اور اس طرح قانون کی حکمرانی RULE OF LAW محض ایک مذاق اور ڈھونگ بن کر رہ جاتا ہے۔ پڑھانے والے سنی سنائی باتیں بغیر کسی ذاتی CONVICTION کے ہمیں پڑھاتے رہے اور ہم کتابوں پر کتابیں رٹتے رہے۔

اس درس نے پہلی بار بہ دلیل و برہان یہ ثابت کیا کہ اس کارگاہِ کون و مکاں کا تمام کاروبار قانون کی حاکمیت کی وجہ سے چل رہا ہے۔ قانون کا اصل ماخذ خود رب العالمین ہے۔ اور ان قوانین کی اصل غرض و غایت دراصل یہی ربوبیت العالمینی اور رحمت کل ہے۔ رحیمیت اور رحمانیت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ کائنات میں RULE OF LAW ہو اور کوئی ہستی اس قلمرو کے قانون سے مستثنیٰ نہ ہو۔ ایسا قانون جو اس حد تک OBJECTIVE ہو صرف خدا ئے خالق و فاطر السموٰت والارض کی ذات ستودہ صفات ہی دے سکتی تھی۔ چنانچہ اُس نے اقدار و اصول قوانین خود مرتب کر دیئے۔ جزئیات کا تعین ہر عہد کے انسانوں پر چھوڑ دیا۔ اس قانون کی تخلیق کے بعد یہ قادر مطلق خود بھی اس قانون کا احترام کرتا ہے اور قادر ہونے کے باوجود اس قانون کی پابندی از خود اپنے اوپر لازم لے لیتا ہے۔ اور اعلان کرتا ہے۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ (۴۳ ؍ ۳۵)۔ چنانچہ یہ زیست یہی قرار پائی، کہ وحی کی رُو سے دنیا میں دیئے گئے اور قرآن کی دفتین میں محفوظ (OBJECTIVE LAWS) ہالائے سر بالاتر ہوں گے۔ ان کی کما حقہٗ نگہداشت اور اطاعت ہی تقویٰ اور عبادت کہلائے گی۔ اور ایمان اور کفر کی تمیز فاصل بھی یہی ہے کہ کون ان قوانین کی پیروی اور اطاعت کرتا ہے اور کون ان سے انحراف کر کے ایک مستقل خسران میں گرتا ہے۔

اور یہ سب کچھ نافذ کرنے کے بعد فرمایا ـــــ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ـــــ اللہ کے سوا کوئی SOVE-REIGN نہیں ہے۔ وہی ہے اختیار اعلےٰ کا مالک اور وہی ہے قانون کا سرچشمہ و منبع اول ـــ میری قانونی تربیت میں اس سے بڑا انقلاب نہ کبھی آیا ہے، نہ آئے گا۔ مجھے یہ علم و حکمت ملنے کے بعد جیسے دلائل و براہین میں ایک ایسا ذہن اور مت پیدا ہو گیا ہے کہ اُن کا جواب بن نہیں پڑتا۔ اور میرے ہاتھ میں ایک ایسا عصائے کلیمی دے دیا گیا ہے جو ہر قسم کی منفل فریب کار کے حیلوں کو نگل کر نیست و نابود کر دیتا ہے۔

صاحبانِ من! میں ریب و تشکیک کے دوزخ میں تھا۔ اس درس میں مجھے آواز ملی ـــــ

" فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي "

الحمد للہ! میں اب ایمان و یقین کی جنت میں داخل ہو چکا ہوں۔ میری دشت نوردیاں اور صحرا پیمائیاں ختم ہو چکی ہیں۔ میری راہیں نورِ حقیقت سے روشن ہو چکی ہیں اور مجھے اس حتم و یقین کی دولتِ لازوال سے مالا مال

کر دیا گیا ہے کہ وہ دن جلد آنے والا ہے جب ربِّ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا تختِ اجلال بہمہ آب و تاب اس دنیائے اَنفس و آفاق پر محسوس طور پر بچھے گا اور معاشرہ قرآنی کا بہشت آغوشِ نظامِ ربوبیت عام ہوگا۔

مجھ پر خدائے کریم کا سب سے بڑا احسان و کرم یہ ہے کہ اُس نے مجھے اپنے عہدِ مومن کے حضور پہنچا دیا ہے جس نے مجھے علم سکھلایا اور پھر تمام علوم کی کنہ و حقیقت سے آگاہ کیا۔ میرے کہنہ سال مرض دور کئے اور مجھے ذہنی شفار اور جلا دی۔ اے ہمسفرانِ چمن! آپ گواہ رہیئے کہ میرے جیب و دامن میں جو قرآنی نکہتیں اور بہاریں رنگ و نور بکھیر رہی ہیں وہ سب کی سب میرے باباجی کا صدقہ اور اُن کی مدت العمر محنتوں کا ثمرہ ہیں۔ خوش بخت ہیں وہ جو میری طرح اس سالارِ کارواں کے رفیقِ سفر رہے ہیں۔ ؎

خوش آں راہی کہ سامانے نگیرد
دلِ او پندِ یاراں کم پذیرد
بہ آہے سوزناکش سینہ بکشاہ
زیک آہش غمِ صد سالہ میرد　　(اقبالؒ)

والسلام

جشنِ تکمیلِ درسِ قرآن

درس کا مفہوم

(محترم شیخ سراج الحق صاحب)

اللہ تعالےٰ نے کائنات کی تخلیق بالمقصد کی ہے۔ کائنات کی مشینری ایک خاص نظم و ضبط اور قاعدہ و قانون کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ یہ قانون اللہ تعالےٰ نے کائنات کی فطرت کے اندر رکھ دیا ہے۔ کائنات کو اپنی زندگی کا راستہ خود متعین کرنے کا اختیار نہیں ہے جو راستہ خدا نے اُس کے لئے متعین کر دیا ہے اُس پر چلنے کے لئے مجبورِ محض ہے۔

صرف انسان کو اللہ تعالےٰ نے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ وہ اپنے لئے جو راستہ چاہے اختیار کر سکتا ہے اس لئے اُسے خارج سے زندگی بسر کرنے کا قانون ملنا ضروری ہو گیا۔ یہ قانون اللہ تعالیٰ نے انسان کو انبیائے کرام کے ذریعہ وحی سے دیا۔ اِسے دین کہتے ہیں۔ یہ ضابطۂ حیات اللہ تعالےٰ نے اپنی آخری

کتاب قرآنِ کریم میں محفوظ کر کے دے دیا جسے اس کے آخری نبیؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھا دیا۔

دین انسان کو دنیا میں رہنا سکھاتا ہے اور دنیا کو سنوارنا سکھاتا ہے۔ دین زندگی کا نصب العین بھی بتاتا ہے اور اس تک پہنچنے کا راستہ بھی بتاتا ہے۔ زندگی کا نصب العین یہ بتایا کہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے اور ماحصل کو خدا کے بتائے ہوئے اقدار کے مطابق نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرے۔ اس سے اُس کی ذات کی نشوونما ہوگی جس سے وہ حیاتِ جاوداں کا اہل ہو جائے گا۔ اس نصب العین تک پہنچنے کا راستہ یہ بتایا کہ انسان اللہ تعالےٰ کی دی ہوئی مستقل اقدار کا مظہر بن جائے، جس سے معاشرہ میں عدل و مساوات قائم ہو کر زندگی کی ناہمواریاں ناپید ہو جائیں گی۔ اللہ تعالےٰ نے دنیا میں بڑی فراوانی سے ہر قسم کی نعمتیں پیدا کی ہیں۔ اگر ان کی تقسیم عدل اور مساوات کی رُو سے ہو جائے تو ہر انسان کے لئے ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی بغیر جگر پاش مشقتوں کے مہیا ہو سکتی ہیں اور وہ اطمینان سے اپنی توانائیاں نصب العین تک پہنچنے میں استعمال کر سکتا ہے۔ اس طرح انسان کی دنیا بھی سنورتی ہے اور آخرت بھی۔

قرآن نے بتایا کہ آخرت اُسی کی سنورتی ہے جس کی دنیا سنوری ہوئی ہو۔ جسے زندگی کی خوشگواریاں نصیب نہ ہوں اُس کی آخرت نہیں سنور سکتی۔ جو یہاں کا اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ جو قوم خدا کے دیئے ہوئے نظامِ زندگی کی پیروی کرے گی، دنیا کی سرفرازیاں اور سربلندیاں اُس کے حصہ میں آئیں گی۔ اور جو قوم اس سے انحراف کرے گی اُس کے لئے دنیا میں رسوائی ہوگی۔ اور بھوک اور خوف کا عذاب ہوگا۔

اس معیار کے مطابق ہم ملّتِ اسلامیہ پر غور کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملّت جسے حاملِ قرآن ہونے کا دعویٰ ہے، ایک شدید سے عذاب کی صورت میں گرفتار چلی آتی ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں غیر مسلموں سے زیادہ نکبت اور زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ غالب اکثریت افلاس میں مبتلا ہے، علم و ہنر سے عاری، جاہ و ثروت سے محروم، ضروریاتِ زندگی کے لئے غیروں کی محتاج۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا ہم نے قانونِ خداوندی سے انحراف کیا ہے؟

انسانیت کے دو بڑے دشمن ہیں۔ ایک "ملوکیت"۔ جو اسے غلام بنا کر اس کا خون چوستی ہے ــــ دوسری مذہبی پیشوائیت، جو اس کے ذہن کو ماؤف کر کے فریب کاری سے، اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر عیش کرتی ہے۔ نظامِ خداوندی انسانیت کو ان دونوں دشمنوں سے نجات دلاتا ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مخالفت کعبہ کے متولیوں نے کی۔ جب یہ سنگِ گراں راستے سے ہٹا دیا گیا اور نظامِ خداوندی متشکل ہو گیا تو اس نظام میں بسنے والی جماعت کو استخلاف فی الارض حاصل ہو گیا۔ قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان سلطنتیں

اس کے پاؤں کے نیچے تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ جماعت خدا کے نظامِ ربوبیت کو وسعت دینے کے لئے آدھی دنیا پر چھا گئی۔ انسان کو ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت سے نجات دلا کر عدل و مساوات کی حکومت قائم کر دی اور بنی نوع انسان نے سکھ کا سانس لیا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ واقعہ بہت دلخراش ہے شکست خوردہ اقوام اسلام کے اندر داخل تو ہو گئیں مگر اُن میں ایک ایسا گروہ شامل تھا جو دل سے ایمان نہ لایا تھا۔ وہ مسلمانوں سے اپنی قوموں کی سیاسی شکست کا انتقام لینے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ اس گروہ نے مسلمانوں میں شامل ہو کر پیشوائیت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ قرآن کو تو بدل نہ سکے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا تھا۔ انہوں نے قرآن کے مقصود و مفہوم کو بگاڑنا اور غیر اسلامی نظریات کو دین میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ کسی نے من گھڑت روایات کو قرآن کے احکام سے ٹکرا دیا، اور کسی نے تصوف کے غیر قرآنی تصورات کو عینِ اسلام بنا کر مسلمانوں کو عمل سے یکسر بیگانہ کر دیا۔ ارباب تسخیرِ فطرت کی جگہ تسبیح و مصلے نے لے لی۔ قرآنی نظامِ زندگی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عجمی سازش کامیاب ہوئی، اور پھر سے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی لعنت مسلمانوں پر مستولی ہو گئی۔ قرآن محض ثواب حاصل کرنے کے لئے رہ گیا اور عمل اُن چیزوں پر ہونے لگا جو ذہنِ انسانی کی تراشیدہ تھیں قانونِ خداوندی کے انحراف کے نتیجہ میں مسلمانوں سے دنیا کی سرفرازیاں اور سربلندیاں چھن گئیں۔ رسوایاں انکے حصہ میں آئیں اور قوموں کی امامت غیر مسلموں کے ہاتھ میں چلی گئی۔

شروع میں مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریاں اسلام کے خلاف جوشِ انتقام کا نتیجہ تھیں۔ بعد میں آنے والوں نے اُن کی تعلیم کو سہل انگاری کی وجہ سے عینِ دین سمجھ لیا اور اپنی اپنی تقلید پرستی سے مسلمانوں پر اسے مسلط کر دیا۔ اور یہ غلط مذہب جس کا دین سے کچھ واسطہ نہیں، صدیوں سے متوارث چلا آرہا ہے جب تک مذہبی پیشوائیت سے ہمیں نجات نہیں ملتی، ہمارا قرآن کی طرف واپس لوٹنا محال ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے سارے ملک میں معدودے چند مذہبی پیشوائیت کی درسگاہیں تھیں۔ ان میں کی اکثریت نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی۔ کیونکہ بانیٔ تحریک قائد اعظمؒ نے برملا کہہ دیا تھا کہ مملکتِ پاکستان میں قرآنی نظام نافذ ہو گا جس میں شخصی حکومت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ ہندوستان کے ان مذہبی پیشواؤں کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا اور ان لوگوں کو شکست ہو گئی۔ لیکن انہوں نے یہاں وہی تکنیک استعمال کی جو صدرِ اول کے مسلمانوں کے ہاتھوں شکست خوردہ اقوام نے اختیار کی تھی۔ یعنی وہ مسلمانوں کے لباس میں اسلام کے اندر آگھسے تھے اور اسلام کی حقیقی روح کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ اسی طرح یہ حضرات پاکستان کی مخالفت کرنے کے باوجود پاکستان میں آگئے اور اپنی شکست کا بدلہ

لینے کے لئے یہ روش اختیار کی کہ جس مقصد کے لئے پاکستان وجود میں لایا گیا تھا وہ پورا نہ ہو سکے ۔ اور اس میں قرآن کی بجائے تسلّط مذہبی پیشوائیت کا قائم ہو جائے ۔ تاریخ میں ہماری بدقسمتی کا یہ دوسرا دور ہے کہ یہ لوگ یہاں کامیاب ہو رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے جال بُری طرح سے پھیلا رکھے ہیں۔ اسکا بیّن ثبوت یہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں جتنے مذہبی دارالعلوم اور مکاتب سارے ملک میں تھے' اُن کی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ اب پاکستان کے ایک ایک شہر میں پائے جاتے ہیں۔ چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف کے ایک بیان کے مطابق قریب ساڑھے کروڑ روپیہ سالانہ ان کی نذر ہو جاتا ہے۔ قبل از تقسیم مذہبی پیشوائیت کی پرورش کے لئے روپیہ دوزخ کے عذاب سے ڈراتے ہوئے نادار اور مظلوم مسلمانوں کی جیبوں سے آتا تھا۔ اب اِس کارِ خیر میں حکومت کا خزانہ بھی شاملِ حال ہے۔ یہ تو اس کا صرف اقتصادی پہلو ہے۔ سیاسی اعتبار سے کیفیت یہ ہے کہ اس بیس سال کے عرصہ میں قرآنی نظام کی طرف کوئی مثبت قدم اٹھنے نہیں پایا۔ جب اور جہاں اس قسم کا کوئی خیال اُبھرتا ہے، مذہب کے یہ اجارہ دار بھِڑوں کے چھتّے کی طرح اُمڈ پڑتے ہیں اور عوام کو اپنے دامِ فریب میں لے کر ہر قسم کا حربہ استعمال کر کے ایسے اقدام کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ اربابِ بست و کشاد بھی اِن سے ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہتے ہیں۔ اور ملک کے دانشور طبقہ کا بھی یہ حال ہے کہ وہ اپنی نجی محفلوں میں اِس رُجعت پسند عنصر کی بے راہ روی کا رونا روتے رہتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ جو کچھ وہ اپنی خلوتوں میں کہتے ہیں' اُسے ذرا باہر نکل کر بہ آوازِ بلند بھی دہرا دیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جس قدر روشن خیالی اور بلند نگہی ہم میں تقسیم سے پہلے آچکی تھی' آج ہم اُس سے پست مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ اگر یہی حالت چندے اور رہی تو ہم اِس دورِ تہذیب و تمدن میں بھی زمانہ متوسط (MEDIVAL AGE) میں جا پہنچیں گے۔

اِس تمام تلاطم خیزی میں صرف ایک روشنی کا مینار ہے جس کی کرنیں اپنی بساط کے مطابق تقلیدی تاریکیوں کو منور کر رہی ہیں اور یہ ہے قرآن کریم کی وہ خالص فکر جو اِس مرکز سے نمودار ہو رہی ہے۔ خدا بھلا کرے اقبالؔ کے تصور کے اِس مردِ درویش کا جو مخالفتوں کے اس بے پناہ ہجوم میں کسی نہ کسی طرح اس چراغ کو جلائے جا رہا ہے۔ اگر ملک کے اربابِ فکر و نظر نے اِس کی تقویت کا سامان پیدا کر دیا تو ہماری قوم نہ صرف زندہ اقوام کی صفِ اوّل میں کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے گی بلکہ قرآن کے وعدہ کے مطابق اقوامِ عالم کی امامت بھی اِن کے حصہ میں آجائے گی۔

ارشاداتِ صدارت

مذاکرہ کے اختتام پر صدرِ محترم، ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے حسبِ ذیل فرمودات ارزاں فرمائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔ (۴/۸۲)

بھلا یہ لوگ قرآن پر غور کیوں نہیں کرتے، اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔

خواتین وحضرات! اگر ایک فقرے میں بیان کرنا چاہوں کہ میں نے درسِ پرویز سے کیا پایا، تو میں کہوں گا کہ میں نے اس سے قرآن کا ربط پایا۔ ہزار سال سے قرآن بے ربطگی کا شکار چلا آرہا تھا۔ کسی تفسیر کو اٹھا کر دیکھئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جابجا اختلاف ہے۔ قرآن کی بے ربطگی ایک مسلّمہ بن چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ آیات وسُورتِ قرآنی کی ترتیب حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بعد کی پیداوار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مدتوں سے قرآن سازشوں کے پردوں کے اندر چھپا ہوا تھا۔ جناب پرویز نے ان پردوں کو تار تار کیا۔ پردوں کا اٹھنا تھا کہ قرآن کے بنیادی تصورات درخشندہ ستاروں کی طرح سامنے آگئے اور بنیادی تصورات سامنے آنے کے بعد قرآن کی تعلیم کا ربط اور حسن برابر دس سال تک اپنی شعاعیں بکھیرتا ہوا چلا گیا۔ اس کے بعد نہ کوئی بے ربطگی نظر آئی نہ اختلاف باقی رہا۔

میرے لئے یہ بیان کرنا کہ میں نے درسِ پرویز سے کیا پایا، بڑا آسان اور بڑا مشکل ہے۔ آسان اس لئے ہے کہ جب چاہوں اس موضوع پر کچھ نہ کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مشکل اس لئے کہ پونے چار صد درسوں میں سے چند ایک کو چھوڑ کر سب کا ایک ایک نکتہ بلکہ اکثر الفاظ میں نے قلمبند کئے ہیں۔ درسِ پرویز نے میری جھولیاں بھر دی ہیں اور اتنا کچھ دیا ہے کہ میں اس کو اٹھانے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اگر ان نکات کو جمع کرنا شروع کر دوں، تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ میں نے ۲۵ جولائی ۱۹۶۷ء کے روز نصف قرآن کریم ختم ہونے پر بھی اسی موضوع پر

ایک مقالہ پیش کیا تھا جس میں قرآن کے چند بنیادی تصورات کا ذکر کیا گیا تھا۔ آج بھی یہی ارادہ رکھتا تھا کہ اسی سلسلے میں کچھ بیان کروں، لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے اس وقت یہ ممکن نہیں۔ ۱۹۶۰ء میں طلوعِ اسلام کنونشن سے غالباً یہ میرا پہلا خطاب تھا۔ اس وقت بھی میں نے کہا تھا کہ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ طلوعِ اسلام سے تمہیں کیا ملا تو میں کہوں گا کہ مجھے طلوعِ اسلام سے CLEAR THINKING ملا۔ اور اس موقعہ پر میں نے ایک واقعہ بھی بیان کیا تھا، وہ یہ کہ ایک مرتبہ تقسیمِ ملک سے پہلے قائداعظمؒ نواب بھوپال سے ملنے گئے۔ واپسی پر نواب صاحب نے اپنے ایک سیکرٹری مسٹر سین کو قائداعظمؒ کے ساتھ بھیجا۔ دورانِ گفتگو میں اس نے قائداعظم سے سوال کیا کہ جناب ملک کی فضا اس وقت بہت خراب ہے، ہر طرف افراتفری اور بے چینی ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟ قائداعظمؒ نے کہا کہ مسٹر سین! آپ خود ہی بتایئے کہ ایسا کیوں ہے۔ اس نے کہا۔ جناب میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی قوم کے اندر (CLEAR THINKING) نہیں رہا۔ قائداعظمؒ نے کہا۔ مسٹر سین! میں اس وقت سیدھا بھی جا رہا ہوں۔ اگر واپسی پر نواب صاحب کے پاس جانا ہوتا تو ان سے کہتا کہ آپ کو بہت بڑی جاگیر بخش دیں۔ حضرات! قوم کے اندر (CLEAR THINKING) کا پیدا ہونا کوئی معمولی چیز نہیں۔ اور آج جہاں تک فکرِ قرآنی کا تعلق ہے اس کا سہرا محترم پرویز صاحب کے سر ہے اس ضمن میں مجھے اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ کس طرح ہمارے سیاسی اور مذہبی لیڈروں نے قومی ذہن میں انتشار پیدا کیا۔

درسِ پرویز کا نفسیاتی اثر

حضرات! محترم پرویز صاحب نے ۱۹۵۸ء میں قرآن کے بنیادی تصورات بیان کرنے شروع کئے اور ۱۰ ستمبر ۵۸ء کے روز باقاعدہ درسِ قرآن کا آغاز ہوا۔ میں آج بے حد خوش ہوں کہ آج سے ۹ برس پیشتر درس میں حاضری کا جو پروگرام میں نے بنایا تھا اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود اسے بخیر و خوبی نبھا سکا ہوں۔ لیکن اس خوشی کے ساتھ میرے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ شاید اب درس ختم ہونے کے بعد میں بوڑھا نہ ہو جاؤں۔ جب درس شروع ہوا، میں نے جوانی سے نکل کر بڑھاپے میں قدم رکھا تھا۔ لیکن آج درس ختم ہونے کے بعد میں پھر سے جوان ہوں۔ ممکن ہے آپ کہیں گے کہ میرے بال سفید ہو گئے ہیں یا میں کمزور نظر آ رہا ہوں۔ لیکن برادران! انسان بالوں کی سفیدی سے نہیں، دل کی موت سے مرا کرتا ہے۔ ہمارے میڈیسن والوں کا کہنا ہے (THE WORST TRAGEDY OF OLD - AGE IS DEPRESSION.) - اور یہ حقیقت ہے کہ جوں جوں انسان عمر میں آگے بڑھتا جاتا ہے، زندگی میں دلچسپی کم ہوتی جاتی ہے۔ پچھلے دنوں ایک شادی پر جانے کا مجھے اتفاق ہوا۔ بڑی ٹھاٹھ باٹھ کی شادی تھی۔ ہر طرف خوشی اور حرکت کے آثار نمایاں تھے لیکن دو بزرگوں کو میں نے دیکھا کہ بغیر کسی کے ساتھ بات کئے ڈیڑھ گھنٹہ تک بیٹھے ایک ہی طرف دیکھتے رہے اور آخر میں اُٹھ کے چل دیئے۔ بڑھاپے میں زندگی سے

دلچسپی کیوں ختم ہو جاتی ہے؟ اول اس لئے کہ عمر کے ساتھ ساتھ زندگی کی اقدار بدلتی جاتی ہیں۔ جوانی میں بچپن کی چیزوں کی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ اور بڑھاپے میں جوانی کی چیزیں بے کار نظر آتی ہیں۔ اس سے آگے کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اس لئے (DEPRESSION) شروع ہو جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شروع میں انسان کی اپنی زندگی کے ساتھ بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ میں یہ کروں گا، میں وہ کروں گا۔ لیکن جب زندگی کا آخری سرا نظر آنا شروع ہو جاتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ میں نے کیا کرایا تو کچھ بھی نہیں۔ بس (DEPRESSION) شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کامیاب انسان زندگی میں بہت کچھ کر گزرتے ہیں۔ لیکن عام انسان بس یونہی وقت گزار کر چل دیتے ہیں۔ پھر یہی وجہ ہے کہ عام آدمی کی زندگی کا منتہائے مقصود مال جمع کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ ھل من مزید کا جذبہ تمام عمر ختم نہیں ہوتا۔ بڑھاپے میں حرص تو باقی رہتی ہے لیکن سکت باقی نہیں رہتی۔ بس (DEPRESSION) شروع ہو جاتا ہے۔

لیکن برادران! جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے محترم پرویز صاحب کی رفاقت، انکے درس میں سالہا سال تک حاضری، اور کانوں میں قانونِ مکافاتِ عمل کی مسلسل آواز، یقین جانیے کہ میں ان تمام عناصر کو جو بڑی عمر میں انسان کی نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں، برابر روندتا ہوا چلا گیا۔ قرآن کی رو سے مایوسی کفر ہے۔ چنانچہ مایوسی کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ اب میں ایک مطمئن انسان ہوں۔ ایسا مطمئن کہ جوانی اور بڑھاپا تو ایکطرف میں سمجھتا ہوں کہ اب موت بھی آئے گی تو کسی اور انداز سے آئے گی۔ اور جب قرآن کہتا ہے کہ زندگی جوئے رواں ہے تو موت آنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟

درسِ پرویز کا کردار پر اثر

حضرات! میں پہلے بھی چند ایک مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس درس میں قانونِ مکافاتِ عمل کی آواز مسلسل کانوں میں پڑنے کے بعد میری حتی الوسع کوشش یہ رہی ہے کہ اپنے ذاتی معاملات میں عدل کو ملحوظ رکھوں۔ واجبات جو میرے ذمے ہوں ان کو دیانت داری سے ادا کروں۔ اور میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے اس درس میں حاضری کے بعد کبھی گورنمنٹ ٹیکسز ادا کرنے میں بھی خیانت نہیں کی۔ میں اس گھر سے تعلق رکھتا ہوں جہاں خاندانی برتری کے احساسات و روایات مدتوں سے متوارث چلے آ رہے تھے۔ تعلیمِ قرآن اور خود محترم پرویز صاحب کا اشارہ تھا کہ یہ غلط ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی اپنے خاندان سے باہر کی۔ لیکن یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ مجھے حقیقتاً اس بات کا احساس ہوا کہ قرآنی نظریات کا زبانی اقرار کتنا سہل ہوتا ہے۔ اور ان نظریات کی بنا پر اپنے دماغ کے بت خانے میں رکھے ہوئے کسی بت کو توڑنا کتنا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔

حضرات! مجھے ان معروضات سے ہرگز یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ میں کوئی بڑا متقی انسان بن گیا ہوں۔

ابھی دماغ کے بت خانے میں بیسیوں بُت موجود ہیں — مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ — کا مرحلہ تو کوسوں دور ہے۔ عوام الناس کی کمیاں دور کر کے معاشرے میں حُسن پیدا کرنا تو ابھی دور کی بات ہے، میں تو ابھی تک یہی نہیں کر سکا کہ اپنے گھر کے ملازموں کے ساتھ برابری کا سلوک کر سکوں، میرے گرد وپیش رہنے والے میرے ساتھ بیٹھ کر وہی کچھ کھائیں جو میں کھاتا ہوں، وہی پہنیں جو میں پہنتا ہوں۔ قرآن کی تعلیم سامنے آنے کے بعد میں اپنی ان کوتاہیوں پر شرمسار ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے کہ میں ان کو دور کر سکوں۔

یہ ہے وہ تبدیلی جو درسِ پرویز نے میرے قلب میں پیدا کی۔ باقی رہی نگاہ کی تبدیلی۔ وہ میں آج سے چند برس پہلے بیان کر چکا ہوں کہ بڑے بڑے مفکر اور بڑے بڑے لیڈر جو پہلے بڑے بھاری بھرکم انسان نظر آتے تھے اب بونے نظر آتے ہیں۔

حضرات! جناب پرویز نے قرآنی حقائق پر سے پردے اٹھا دیئے ہیں اور قرآنی حقائق کا یہ عالم ہے کہ جوں جوں پردے اٹھتے جاتے ہیں ان کی وسعتیں اور زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ اب یہ ذمہ داری سامعینِ درسِ پرویز پر عاید ہوتی ہے کہ ان کو جو راستہ دکھایا گیا ہے اس کو مزید (EXPLORE) کرتے جائیں۔ قرآنی مطالب میں مزید تحقیقات کے لئے مختلف علوم کے ماہرین کی ٹیم ورک کی ضرورت ہے۔ اور خاص کر سائنس دانوں کو اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔

دُعا

میں آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اے ربّ العالمین! تحقیقِ علمِ قرآن کے جس پودے کو محترم پرویز صاحب نے بویا ہے تو اس کی آبیاری کر۔ تاکہ یہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا ایک تناور درخت بنتا جائے۔ اور آنے والی نسلیں اس سے ہمیشہ ہمیشہ مستفید ہوتی رہیں۔

یا اللہ! — ہم گواہ ہیں کہ محترم پرویز نے مسلسل دس سال تک تیرے پیغام کو نکھار ابھار کر ہم تک پہنچایا ہے۔ ہم گواہ ہیں کہ دس سال تک تیرے قرآن کی آواز تیرے پرویز کی زبان سے نکل کر گنبدِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل بنتی رہی ہے۔

یا اللہ! — ہم گواہ ہیں کہ محترم پرویز نے ہمیں صحیح معنوں میں مقامِ محمدیؐ سے آشنا کیا اور تیرے رسولوں کی عظمت، وقار اور محبت کو ہمارے دلوں میں دہ چند کر دیا۔

یا اللہ! — تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ دنیا میں محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے جھنڈے کو اس مقامِ بلند تک پہنچا سکیں جہاں وہ خود حضورؐ کے زمانے میں تھا۔

یا اللہ! — محترم پرویز نے تیری اور تیرے رسولوں کی اطاعت اور نظامِ صلوٰۃ کے قیام کو جس انداز سے واضح کیا ہے، تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اس پر عمل پیرا ہو سکیں۔

یارب العالمین! ۔۔۔ محترم پرویز نے ہمیں تیری صفتِ ربوبیت اور تیرے نظامِ ربوبیت کے صحیح مفہوم سے آگاہ کیا۔ تو ہمیں توفیق دے کہ ہمارے قدم عملی طور پر نظامِ ربوبیت کے قیام کیطرف اٹھیں۔

یا اللہ! ۔۔۔ ہم گواہ ہیں کہ مسلسل دس سال تک محترم پرویز نے تیرے قانونِ مکافاتِ عمل کو مختلف پہلوؤں سے اجاگر کر کے ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ یا اللہ! تو سمیع و بصیر ہے۔ اب اس کے بعد ہمارے اعمال میں جو سیئات ہوں گی وہ ہماری اپنی طرف سے ہوں گی اور جو حسنات ہوں گی وہ تیرے قرآن اور تیرے رسول کی رہنمائی، اور محترم پرویز کی جہدِ مسلسل کا نتیجہ ہوں گی۔

یا اللہ! ۔۔۔ تو نے اپنے قرآن پر توجہ دینے کے لئے ہمیں استقلال عطا فرمایا۔ اب تو ہمیں توفیق دے کہ ہمارے اعمال اس بات کی گواہی دیں کہ ہم تیرے شکرگذار بندے ہیں۔

یا اللہ! ۔۔۔ تو ہمیں توفیق دے کہ محترم پرویز کی دس سال کی محنتِ شاقہ نے ہم سے تیرے پیغام پر عمل پیرا ہونے کا جو خاموش وعدہ لیا ہے ہم اس سے وفا کر سکیں۔

آخر میں دعا کروں گا کہ یا اللہ ۔۔۔! اس قافلۂ شوق کے جن ہمسفروں کو موت نے ہم سے بچھاڑ دیا ہے تو انکو اپنی حفاظت میں رکھ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

جہانِ نو

وہ کتابچہ جسمیں طلوعِ اسلام کے شائع کردہ انقلاب آفریں لٹریچر کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ ایک کارڈ لکھ کر

مفت طلب فرمائیے!

اس قسم کا لٹریچر آپ کو اور کہیں نہیں مل سکے گا!

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

خورشید عالم

"خلاء" کا عالمی کردار

خلا کیا اور اس کا کردار کیا! نہ یہ ملک نہ قوم!! درست۔ لیکن دیکھتے دیکھتے صرف دس سال کے قلیل عرصہ میں، خلا، کرۂ ارض کے معاملات میں اس قدر دخیل ہو چکا ہے کہ انسان تو کیا زندگی تک کی بقار کا دار و مدار اس پر ہو گیا ہے کہ خلا، زمین سے کیا سلوک کرتی ہے اور یہ فطرت کی کارستانی نہیں' یورپ کا کرشمہ ہے۔ جب سے انسان نے آنکھ کھولی ہے وہ خلا کو حیرت سے دیکھتا چلا آیا ہے اور اس کے اسرار میں گم رہا ہے۔ وہ کبھی وثوق سے جان نہ سکا کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کی بے پایاں وسعتوں نے اپنی آغوش میں کیا کیا چھپا رکھا ہے۔ وہ جان بھی کیا سکتا تھا، وہ ایک حد تک نظر اور بہت حد تک خیال سے کام لے کر قیاس آرائی کر سکتا تھا۔ اور یہ کام اُس نے خوب خوب کیا۔ اس کا تخیل اس بے حدود اور بے ثغور پہنائی میں ابتدا ہی سے کھویا رہا۔ اور اس سربستہ راز کی گرہ کھولنے کے لئے کائناتی ڈور کا سرا ڈھونڈنے میں لگا رہا۔ سرگردانی اور تلاش نے اس کے فکر کو نئی بلندیاں، اور نئی وسعتیں عطا کیں، اور وہ صعود اور معارج کے تصور سے آشنا ہوا۔ وہ بارہا ان زمینوں سے چڑھا، بارہا اترا۔ اس کا تصور سوئے افلاک گیا تو، اور راز ہائے افلاک واپس آیا تو' ہر بار وہ روحانی اور وجدانی کیفیتوں سے دوچار ہوا۔ ستاروں کی جھلملاہٹ، چاندکی ضیاء اور سورج کی تپش میں اس نے اپنے آپ کو فطرت سے اور قریب محسوس کیا۔ اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی وجد آفریں کوشش اس کے ذہن کو علو اور روح کو بالیدگی بخشتی رہی۔ یوں اس نے شام وسحر کے نقش کو سوختہ ہونے سے بچائے رکھا۔ اور معمولات زندگی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تازہ دم ہوجاتا رہا۔ لیکن قرآن کا اعلانِ وسعت نا آشنا کہ "وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ" (جو کچھ فضا کی بلندیوں میں ہے' اسے بھی ہم نے تمہارے تابع تسخیر کر رکھا ہے) انسان سے کچھ اور مطالبہ کر رہا تھا۔

گلیلیو نے سولہویں صدی میں نو ایجاد کردہ دوربین کی مدد سے انسان کی حدِ نگاہ سے ذرا آگے جھانک کے دیکھا تو انسانی تخیل خلا کی رفعتوں سے گر کر مشین کی پستیوں تک آن پہنچا۔ اس کا آوارۂ افلاک فکر مشینوں کی

پیٹ میں آیا تو اس کے کمالات کی حد برقی دیجارات تک محدود ہو کے رہ گئی اور مسعود معارج کے زینے اس کے پاؤں تلے سے نکلنے لگے۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ مشینیں انسانی تخیل کے پر و بال نوچتی رہیں تا آنکہ وہ وقت آیا طائرِ فکرِ انسانی مفلوج ہو کر زمین پر آ رہا۔ اور مشینیں آسمانوں سے باتیں کرنے لگیں۔ یہ انقلاب ۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو آیا جب روس نے سپٹنک نامی مصنوعی سیارہ خلاء میں بھجوا کر ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں غرق کر دیا۔ اقوامِ عالم نے اسے بالعموم علمِ انسانی کا ایک عظیم کارنامہ قرار دیا اور روسی سائنسدانوں اور ہنرمندوں کو اس فقید المثال کامیابی پر بے ساختہ خراجِ تحسین ادا کیا۔ امریکی اصحاب البتہ ششدر ہو کے رہ گئے۔ اور یہ تھا بھی قابلِ فہم۔ جیسا کہ پہلے وضاحت کی جا چکی ہے، دوسری جنگِ عظیم کے بطن سے امریکہ ایسی قہرمان اور باجبروت طاقت کی حیثیت سے ابھرا تھا کہ کوئی قوم بھی اس کے منہ نہیں آ سکتی تھی۔ وہ ایٹم بم جیسی نو دریافت اور غیر معمولی طور پر تباہ کار قوت کا مالک تھا اور اس ایک لاٹھی سے دنیا بھر کی بھینسیں ہانک لے جا سکتا تھا۔ لیکن یہ لاٹھی جو جاپان میں جادو کا کرتب دکھا چکی تھی، چین میں سلیمان کی لاٹھی کی طرح کرم خوردہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ امریکہ نے چین سے کاغذ کے شیر کا لقب پایا۔ امریکہ یوں کاغذی پیرہن ہو کر بھی اپنی ایٹمی قوت کی شوخیٔ تحریر سے مسحور ہی تھا کہ روس بھی ایٹم بم بنا لینے میں کامیاب ہو گیا گویا چین اس سے دب نہ سکا اور روس مدِمقابل ہو گیا۔ یہ کاری صدمات امریکہ کے اعلائے استعمار کو ریزہ ریزہ کر گئے۔ رہی سہی کسر ۱۹۵۷ء میں نکل گئی جب روس نے ترقی کرتے کرتے خلاء تک میں قدم رکھ دیا، اور امریکہ کو زمین پر ہی دم بخود چھوڑ دیا۔

امریکہ روس کے اس اقدام پر جس قدر بھی پیچ و تاب کھاتا کم تھا۔ اندیشہ ہائے دور و دراز نے اس پر لرزہ طاری کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر روس مصنوعی سیارے کو دور خلاء میں پہنچا سکنے کے قابل ہے تو اس کے دستِ قدرت میں ایسے دور مار میزائل ہونے چاہئیں جن سے امریکہ کا ملکی دفاعی نظام تباہ و برباد کیا جا سکتا ہے۔ گویا بساطِ عالم پر امریکہ صفِ اول سے اٹھا کر صفِ دوم میں بٹھایا جا رہا ہے۔ مصنوعی سیارے کی تباہ کارانہ ممکنات اس پر مستزاد تھیں۔ مثلاً اگر روس ترقی کرتے کرتے چاند تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو وہاں میزائل کے اڈے نصب کر کے وہ امریکہ کو زد میں لے سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصنوعی سیارے عالمی جاسوسی کے لئے استعمال ہونے لگیں یا ان سے بم برداری یا بم باری کا کام لیا جانے لگے۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ جنگ جو کبھی بری تھی، پھر بحری ہوئی، اور پھر فضائی، اب خلائی ہو جائے۔ یہ تصور امریکہ کی ذات میں تہلکہ مچانے کے لئے کافی تھا۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز کر دی کہ خلائی میدانِ جنگ میں وہ کم سے کم وقت میں اور زیادہ سے زیادہ قوت کے ساتھ روس کے روبرو ہو جائے، بلکہ اسے مات نہ دے سکے تو بہت پیچھے بھی نہ چھوڑ جائے۔ کوئی ساڑھے چار مہینے میں ہی وہ، روس کے مقابلے میں، ننھا سا ستارہ مدار میں پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ

کامیابی اسے کئی ناکامیوں کے بعد ہی حاصل ہوئی اور اس شدید خفت کے بعد بھی کہ روس اس پر سبقت لے گیا اور اس کا کارنامہ امریکہ کے مقابلے میں کہیں بڑا ہے۔

اس کامیابی نے امریکہ کے سامنے ایک نئی ممکنات کی دنیا لا کر کھڑی کر دی۔ مشین کی "خودی" خلا تک بلند ہوتے دیکھ کر وہ سوچنے پر آگیا کہ اب خدائے کائنات امریکی بندے سے پوچھے بغیر نہیں رہے گا کہ "بتا تیری رضا کیا ہے؟" اور پوچھے گا تو تیر قضا کا ہوگا اور کمان امریکہ کی ہوگی۔ دل ہی دل میں اس نے اس تیر کا رُخ روس کی طرف موڑ دیا۔ اور اس کے پیکان کو خوب ہی زہر میں بجھایا۔ طرح طرح کے منصوبے اس کے نہاں خانۂ دماغ سے ابھرے۔ ایک خاکہ تیار ہوا جسے "قیامت" کا نام دیا گیا۔ اس میں رنگِ عمل پوری طرح بھر لیا گیا تو اس کی مدد سے روئے زمین پر تمام انسانی آبادی ختم کی جا سکے گی۔ بم کی ایک نئی قسم پر بھی کام ہونے لگا جسے "نیوٹرون بم" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ شعاعِ موت ہوگی جو خلاء کے بطن سے پھوٹے گی۔ اور اتنی بلندی سے چھوڑی جائے گی کہ اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکے گا کہ یہ کس خورشید قیامت کی دخترِ رستاخیز ہے۔ شعاع تین تین فٹ موٹی دیواروں تک میں سے گزر جائے گی۔ اور انسان جس حال میں ہوں گے اسی حال میں انہیں موت کی آغوش میں پہنچا دے گی۔ زندہ انسان دیکھتے دیکھتے بے جان لاشے بن جائیں گے اور ان کے جسم پر خراش تک نہیں آئی ہوگی۔ ایک ایسا راکٹ بھی زیرِ تیاری ہے جسے خلاء میں یوں چلایا جائے گا کہ وہ کسی کرۂ یا سٹلائٹ کو اس طرح مدار سے ہٹا دے کہ اسے زمین پر جہاں چاہیں، گرایا جا سکے۔ زمین کے جس حصے کو یہ حادثہ پیش آئے گا، وہاں شاید ہی کوئی شے زندہ یا محفوظ رہ سکے۔ اور کوئی یہ وثوق سے نہیں کہہ سکے گا کہ حادثہ دشمن کی کارروائی کا نتیجہ ہے یا آسمانی بلائے ناگہانی ہے۔

اسی پر بس نہیں، دختران مادر ایام اور کئی طرح کی بھی ہوں گی۔ خلائی سٹیلائٹ اسلحہ سے معمور قلعے ہوں گے ان میں ایسے عظیم الشان اور تباہ کن بم ہوں گے جن کا تصور بھی خلا سے ادھر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ "خلائی بم" مسلسل اپنے مدار میں رہیں گے اور انہیں ضرورت کے مطابق جب چاہا استعمال کیا جا سکے گا۔ منصوبہ تیار ہوا تھا تو طے ہوا تھا کہ ایسے سینکڑوں بم روس کے اوپر منڈلاتے رہیں گے۔ چین کے مقدر کے ستارے یقیناً ان کے علاوہ ہوں گے۔ یہ کچھ تو امریکہ کی سوچ اور تیاری ہے۔ روس کی سوچ اور تیاری، اپنے طور پر بھی اور اس کے جواب میں بھی، اس سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ اس کے بھی خلائی بم اور سٹیلائٹ قلعے اسی طرح تیار بر تیار اپنے اپنے مدار پر رواں دواں ہوں گے۔ اس صورت میں ضرورت لاحق ہو جائے گی کہ دشمن کے سیارے کے اندر جھانک کر دیکھا جائے اور اسے بے کار اور غیر مؤثر کر دیا جائے۔ ایسا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ انتظام ہو کہ دو سیارے خلاء میں ایک دوسرے سے مل سکیں۔ ایسے ملاپ کا تجربہ کرنے میں روس کامیاب ہو گیا ہے۔ حال ہی میں اس کے دو سیارے زمینی ہدایت کے مطابق ایک طے شدہ مقام پر ملے۔ اور ساڑھے تین گھنٹے ملے رہنے کے بعد علیحدہ ہو گئے۔ یا کر

دیے گئے۔ اس سے پہلے امریکہ یہ تجربہ کر چکا ہے کہ سیارے سے نکل کر انسان خلاء میں کچھ وقت گزار کے
واپس سیارے کے اندر آگیا۔ دونوں تجربے دشمنی سیارے کو تباہ کرنے کے سلسلے میں ابتدائی اقدامات ہیں۔
یہ تیاریاں، خلاء کو شریکِ جنگ کرنے کے لئے بھی ہیں، اور خلاء میں جنگ کرنے کے لئے بھی۔ گویا خلاء جنگ
کا فریق بھی ہے اور جنگ کا محاذ بھی۔ اور یہ صرف تخیل کی خلاقی نہیں۔ ان منصوبوں پر زور و شور سے کام ہو رہا ہے اور
یہ کہہ کر ہو رہا ہے کہ امریکہ کو جلد از جلد ان منصوبوں کی تکمیل کر لینی چاہیئے کیونکہ وہ ایسا نہ کر سکا یا ایسا کرنے میں اس
نے دیر کر دی، تو روس ان اسلحہ سے لیس ہو کر خلاء پر مسلط ہو جائے گا اور زمین پر امریکہ کا جینا محال کر دے گا۔
روس کے مقابلے میں خلائی جنگی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں اور خلاء ہی سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا جا رہا ہے کہ اپنے ہاں
روس کر کیا رہا ہے۔ ۲۸ فروری ۱۹۵۹ء کو امریکہ نے پہلا مخبر سیارہ خلاء میں بھیجا۔ اب تک نوبت یہاں تک پہنچ
چکی ہے کہ سیارائی کیمروں سے روس کے اندر کھانے کی طشتریوں تک کی تصویریں لی جا سکتی ہیں۔ ریلوں، سڑکوں
فولاد اور تیل کے کارخانوں، ایٹمی اور میزائلی اڈوں کو تو یوں دیکھا جا رہا ہے جیسے چشمِ ظاہر بیں سے دیکھا جائے۔
امریکہ چین کے اندر بھی اسی طرح مسلسل جھانکے چلا جا رہا ہے۔ وہ ایسے بامِ بلند پر جا کے بیٹھ گیا ہے جہاں سے
وہ جس وقت چاہے اور جس جگہ چاہے دوربین اور احساس کیمروں سے تصویریں کھینچ سکتا ہے اور کھینچ رہا
ہے۔ اگر ریڈیو اور ٹیلیویژن نے افراد کی خلوت غارت کی تھی تو خلائی سیاروں نے قوموں کی خلوت ختم کر کے
رکھ دی ہے۔ یہ عجیب صورتِ حال ہے۔ معاشرتی اعتبار سے اور کہیں تو کیا خود امریکہ میں کسی پاگل ہی کا کام
ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دروازے یا کھڑکی سے لگ کے کھڑا ہو جائے اور دیکھے چلا جائے کہ افرادِ خانہ کیا کر رہے
ہیں یا کیا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن خلاء میں پہنچ کر امریکہ کی نگاہوں سے روئے زمین کا کوئی گوشہ بھی محفوظ نہیں
رہا۔ گویا انسان بھری دنیا میں ننگا ہو گیا ہے۔ یہ اس یورپی تہذیب کی کارستانی ہے جس کا مظہر امریکہ ہے اور
جو اخلاق و اقدار سے عاری ہی نہیں، ان کی قاتل بھی ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو سابقہ قسطوں میں کی جا چکی ہے۔
یورپی تہذیب یعنی بالفاظِ صحیح تر امریکی استعمار کا نتیجہ ہے کہ سائنس دانوں نے پچیس سال پہلے (۲ دسمبر
۱۹۴۲ء کو) ایٹم توڑ کر قوت کا بے پناہ سرچشمہ معلوم کر کے ایک انقلابِ عظیم کی بنیاد رکھی تو اس کا ثمرہ دنیا کو
جاپان کے دو شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کی شکل میں ملا۔ اور بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ ان
بے پناہ تباہ کار بموں تک پہنچی کہ جن کے چلانے کے لئے ایٹم بم درکار ہے۔ پھر بات زمین تک محدود نہیں رہی
بلکہ فضا سے آگے نکل کر خلاء تک پہنچ گئی۔ بر ہو یا بحر، فضا ہو یا خلاء، ذہنیت ہر جگہ ایک ہی کارفرما ہے۔ امریکہ
دیوانہ وار ۱۹۴۵ء کی وہی حیثیت اختیار کرنا چاہتا ہے جب وہ ایٹم بم کا تنہا مالک تھا اور باقی ساری قومیں اس
کے سامنے دم بخود تھیں۔ وہ افسانوی حد تک امیر ملک ہے۔ لیکن اپنی آمدنی کا تین چوتھائی حصہ جنگی تیاریوں پر

صرف کر رہا ہے اور تیاریاں بھی ایسی جن کا نتیجہ یقینی ہمہ گیر تباہی ہے۔ امریکہ یہ تیاریاں جاری رکھنے اور ان میں توسیع کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی معیشت کا دارومدار ہی ان تیاریوں پر ہے۔ وہ کوئی ایک منصوبہ روک دینے کا فیصلہ کرے تو وہ تمام عناصر طوفان کھڑا کر دیں جن کا مفاد اس سے وابستہ ہے۔ ان عناصر میں صنعت تجارت اور فوج کی بڑی بڑی شخصیتیں شریک ہیں۔ انہوں نے امریکہ ہی کی نہیں پوری دنیا کی قسمت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ اپنے زمانہ صدارت میں آئزن ہاور نے اسے "صنعتی فوجی ملی بھگت" قرار دیا اور اس پر سخت سے تنقید کی۔ لیکن وہ خود اس کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ بجٹ سے زیادہ حصہ لینے اور اس کے خرچ سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لئے فوجی اور صنعتی عناصر نے مل کر یہ بے جواز مہم شروع کر دی کہ امریکہ میزائل کے معاملے میں روس سے پیچھے رہ گیا ہے۔ یہ مہم پورے امریکہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلا دی گئی۔ آئزن ہاور نے اس کی تردید بھی کی لیکن یہ طوفان نہ تھما۔ انتخاب جیتنے کے لئے کینیڈی نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ یہ حربہ اس قدر مؤثر ثابت ہوا کہ آئزن ہاور شکست کھا گئے۔ چونکہ کینیڈی کی فتح میں اس بے جواز اور بے بنیاد مہم کا نمایاں ہاتھ تھا، اس لئے کینیڈی کے برسراقتدار آنے پر صنعتی اور فوجی حلقوں نے خوب ہاتھ رنگے۔

اس صنعتی فوجی ملی بھگت کے خلاف اور امریکنوں نے بھی دل سوزی سے بات کی ہے اور قوم کو بیوقوف بنانے کی اس دیدہ دلیرانہ سازش کا بھرم بڑی جرأت اور بے باکی سے کھولنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ریڈیو، ٹیلیویژن اور اخبارات کے ملک گیر ذرائع ابلاغ و معلومات اس سازش کے اس قدر سرگرم کارندے بن جاتے ہیں کہ جھوٹ اور سچ میں تمیز ناممکن ہو جاتی ہے، اور حکومت اس فریب کاری اور فریب دہی کی مہم کے سامنے بے بس ہو کے رہ جاتی ہے۔ امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جس میں کاروباری مسندوں اور حکومتی مناصب پر متمکن معدودے چند افراد کمال ڈھٹائی سے پوری قوم کو اُلّو بناتے ہیں اور بے دریغی سے ملکی دولت لوٹتے ہیں، اور یہ لوٹ ملکی مدافعت کے نام پر مچائی جاتی ہے۔ اور مدافعت کے تصور کو کھینچ کھینچ کر کبھی ویٹ نام تک پہنچایا جاتا ہے اور کبھی چاند تک۔ امریکی معیشت میں فساد کی یہ کیفیت نہ ہو تو کوریا اور ویٹ نام میں جنگ کا کوئی جواز نہ رہے، ہمالیہ کے چشمے آگ نہ اُگلیں، بھارت اپنی آزادی کا سودا کر کے برصغیر کو جنگاہ نہ بنا دے روڈیشیا بغاوت کرنے کی جرأت نہ کر سکے، اسرائیل پاگل ہو کر ہمسایوں کو کاٹنے نہ لگے، الجزائر میں حکومت کا تختہ نہ اُلٹے، انڈونیشیا میں انقلاب قیادت نہ ہو، چین پر اقوام متحدہ کے دروازے یوں بند ہوں کہ ان کے کھلنے کی نوبت تک نہ آئے۔ الغرض، یہ دنیا انسانوں کی بستی بننی شروع ہو جائے۔ چونکہ صنعت اور فوج کا مفاد جنگی تیاریوں سے وابستہ ہے اس لئے نت نئے ہوّے کھڑے کر کے تیاریوں کی رفتار برقرار ہی نہیں رکھی جاتی، اس میں اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل امریکہ کو بار بار یقین دلاتے کی

کوشش کی جاتی ہے کہ ملک کا دفاع یہاں تک مضبوط کیا جا رہا ہے کہ دشمن (روس یا چین یا دونوں) امریکہ کو کوئی قابلِ ذکر گزند نہ پہنچا سکیں۔ اس لاف وگزاف کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم ان پر کلی بھروسہ کر کے ان کی حب الوطنی اور کارگزاری کی معترف رہے اور لوٹ مچی رہنے دے۔

صنعت اور فوج کی ملی بھگت نے امریکی معیشت کو جس راہ پر ڈال رکھا ہے اس پر چلے جانے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی روس یا چین موجود ہو جس کو سامنے رکھ کر جنگی تیاریاں زور شور سے جاری رکھی جائیں۔ ایک امریکی مصنف کہتا ہے کہ اگر ویٹ نام کا مسئلہ نہ ہوتا تو اسے پیدا کر لیا جاتا۔ اس سلسلے میں ایک ایسی مثال سامنے آتی ہے جو امریکہ جیسا ملک ہی پیش کر سکتا ہے۔ نومبر ۱۹۴۳ء میں پتہ چلا کہ جنگی ضرورت کے لئے امریکہ نے اس قدر اسلحہ اور بارود تیار کر لیا ہے کہ اگلے سال ۱۹۴۴ء میں پیداوار کم کر دینے کی ضرورت ہوگی۔ حساب لگایا گیا کہ جنگی اخراجات میں ایک ارب ڈالر ماہانہ کی تخفیف کر دی جائے تو بھی جنگ کے تقاضے پورے کئے جا سکیں گے۔ اس تخفیف کا مطلب یہ ہوتا کہ ہزاروں کارکن بیکار ہو جاتے، متعدد کارخانے بند کر دینے پڑتے اور بہت سے کام روک دیئے جاتے۔ اس کی زد چھوٹے کاروباری اداروں پر سب سے پہلے پڑتی جو بڑے اداروں کے لئے چھوٹے چھوٹے کام کر رہے تھے۔ ان اداروں نے بیکاری سے بچنے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ انہیں اشیائے صرف بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ تاکہ ایک طرف وہ بیکار نہ ہوں اور دوسری طرف جنگ کی وجہ سے اشیائے صرف کی جو قلت واقع ہو چکی ہے، وہ دور ہو سکے۔ بڑی معقول اور حقیقت پسندانہ تجویز تھی مگر بڑے اداروں نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی کیونکہ انہیں ڈر پیدا ہو گیا کہ اگر چھوٹے ادارے غیر جنگی کاروبار میں لگ گئے تو جنگ ختم ہو جانے پر جب وہ خود اس کاروبار کی طرف متوجہ ہوں گے تو انہیں ان سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ فوج نے ان بڑے کاروباری اداروں کو فوراً کمک پہنچائی اور اس کے نمائندے نے یہ خلافِ حقیقت بیان دیا کہ سازوسامانِ جنگ کی پیداوار گرتی جا رہی ہے ۔۔۔ لہٰذا عام کارکن جنگی کام چھوڑ کے اس پیداوار کو مزید کم نہ کریں ۔۔۔! یہ مہم کامیاب ہوتی اور ضرورت نہ ہونے کے باوجود جنگی پیداوار جاری رہی۔ یہ امریکہ کا اندرونی معاملہ ہوتا تو اسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ سامانِ جنگ بے دریغ بنے گا تو وہ خرچ بھی بے دریغ ہو گا۔ بلکہ اسے خرچ کرنے کے بہانے ڈھونڈے اور تراشے جائیں گے۔ امریکہ کی اسی دشواری نے دنیا بھر کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایٹمی توانائی کے متعلق بلند بانگ دعوے باندھنے کے باوجود اس کے تباہ کارانہ پہلو پر ہی خصوصی زور دیا گیا اور زیادہ سے زیادہ ہلاکت آفریں بم معرضِ وجود میں لائے گئے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ خلا میں پہنچنے سے عالمی تباہی کا امکان کہیں بڑھ گیا ہے۔ اپنی قوم کو بھی اور دوسری قوموں کو بھی امریکہ یہ جھوٹی تسلی دیتا رہتا ہے کہ وہ خلا کا استعمال جائز مقاصد

کے لئے کریگا۔ اور جو آلاتِ ہلاکت بحر و بر خلا میں جمع کر رہا ہے ان کے استعمال میں بڑی احتیاط سے کام لیگا۔ قطع نظر اس سے کہ امریکہ یہ بات خلوص نیت سے نہیں کر رہا، اس کی تدابیر پر تقدیر اپنے انداز سے مسکراتی ہے اور فطرت مسکراتی ہے تو یہ روح فرسا تصور انسانی آنکھ کے سامنے ناچتا رہ جاتا ہے کہ احتیاط کے باوجود محض اتفاق سے قیامت لائی جا سکتی ہے۔

۵ر اکتوبر ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ کالوریڈو سپرنگز کے مقام پر انتہائی خطرناک جنگی مرکز چیدہ کاروباری شخصیتوں کو دکھایا جا رہا تھا۔ انہیں ایک جگہ دکھائی گئی جہاں پانچ روشنیاں تھیں اور انہیں بتایا گیا کہ اگر دشمن کے میزائل آ رہے ہوں تو یہ روشنیاں ان کی آمد سے خبردار کر دیں گی۔ پہلی روشنی کا مطلب یہ ہوگا کہ (دور فضا میں) کچھ ناقابل شناخت اشیاء ہیں۔ دوسری روشنی بتائے گی کہ اشیاء نسبتاً زیادہ تعداد میں ہیں وغیرہ۔ پانچوں روشنیاں نمودار ہو جائیں تو یقین کر لینا چاہیئے کہ دشمن نے وار کر دیا ہے اور قیامت نازل ہونے والی ہے۔ یہ وضاحت ختم ہی ہوئی تھی کہ یکے بعد دیگرے پانچوں روشنیاں بھڑک اٹھیں۔ مرکز میں کہرام مچ گیا۔ یقیناً دشمن نے میزائل چلا دیئے ہیں اور بیس منٹ میں وہ امریکہ پہنچ کر پھٹ جائیں گے اور ملک تباہ ہو جائیگا۔ سربراہِ مرکز کے پاس یہی چارہ تھا کہ وہ ایک لمحے کے توقف کے بغیر جوابی کاروائی کرتا لیکن کچھ سوچنے سے اسے یاد آگیا کہ وزیر اعظم روس، خروشچیف، امریکہ کا دورہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ سربراہ نے نتیجہ نکالا کہ روس میزائلی حملے کے لئے ہرگز ایسا موقع منتخب نہیں کر سکتا جب اس کا وزیر اعظم اسی ملک میں موجود ہو۔ یہ بالکل اتفاق تھا، کہ روسی وزیر اعظم امریکہ میں تھے اور سربراہِ مرکز کو ان کی موجودگی کا خیال آگیا اور اس نے کوئی جوابی کاروائی نہ کی۔ ورنہ روسی میزائل امریکہ پہنچتے یا نہ پہنچتے، امریکی میزائل روسی نشانوں تک ضرور پہنچا دیئے جاتے۔ کوشش بسیار کے باوجود یہ پتہ نہ چل سکا کہ یہ پانچوں روشنیاں کس خطرے کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ خیال یہ ہے کہ وہ کسی خلائی "پیغام" کا جواب دے رہی تھیں۔ اسی طرح ایک بار ایک میزائل بغیر چلائے چلنے کی تیاری کرنے لگا اور اس میں سے شرارے نکلنے شروع ہو گئے۔ بہت سر مارنے کے بعد بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کیسے حرکت میں آگیا۔ ایک قیاس یہ کیا گیا کہ پولیس کی گاڑیوں سے دیئے جانے والے وائرلیس پیغامات "میزائل" کے "دماغ" پر اثر انداز ہو گئے اور ان سے وہ کارفرما ہونے لگا۔ اس طرح کے اتفاقات درجنوں مرتبہ ہو چکے ہیں۔ اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ دنیا پر وہ قیامت ایک بار بھی نازل نہ ہوئی جو ان آلاتِ ہلاکت سے نازل ہو سکتی ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ عالمی تباہی کے سامان اتفاق سے ہی نہیں ہو جائیں گے۔ اور یہ تو ان آلات کی بات ہے جو زمین پر نصب ہیں۔ ان میں خلائی آلات بھی شامل ہو گئے تو عالمی تباہی کے امکانات کہیں زیادہ ہو جائیں گے۔ یہ اتفاقات قدرت کی طرف سے سنگین انتباہ ہیں۔ امریکہ کا جنون بلا خیز ہو سکتا ہے، اس کی طاقت بھی بے پناہ

ہو سکتی ہے لیکن حرفِ آخر امریکہ کے پاس نہیں کسی اور کے پاس ہے۔ انسانی دنیا میں حرفِ آخر طاقت نہ کبھی ہوئی نہ ہوگی۔ آلاتِ ہلاکت بنائے چلے جانے اور انہیں بحر و بر اور فضا و خلا میں نصب کئے چلے جانے میں ہی خرابی کی یقینی صورت مضمر ہے اور یہ بعید از قیاس نہیں کہ شرق و غرب وہ تماشہ یونہی کسی دن اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جو ابلیس کی طرف سے اقوامِ یورپ کا لہو گرمائے چلے جانے کا لازمی نتیجہ ہے۔

لیکن امریکہ کو ان نتائج کی فکر نہیں جو اس کی فتنہ سامانیوں اور شیطنت کاریوں سے انسان کا مقدر بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسے فکر ہے تو صرف یہ کہ استعمارِ یورپ کو زوال نہ ہو۔ وہ اس زوال کا اس وقت تک تماشائی بنا رہا جب تک یہ اقوامِ یورپ کی سیاسی شکست اور پسپائی تک محدود رہا۔ لیکن جب سے اس استعمار کا علم بردار وہ خود بنا ہے، اس نے اپنی معاشرت اور معیشت کو اس حد تک استعمار سے وابستہ کر لیا ہے کہ استعمار کی پسپائی اس کے ملکی نظام کو درہم برہم کر دینے کا موجب ہوگی۔ استعمار پر اس کا انحصار اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ بحر و بر و فضا اس کی تسکین کرنے سے قاصر رہ گئے ہیں۔ اب وہ اپنے جنونِ استعمار کو خلا میں لے آیا ہے کہ شاید یہ ویرانے سے ..... سنبھال سکے۔ وہ مجبور ہے کہ علم اور دولت کے زور سے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرے اور انہیں سوا نیزے پہ لے آئے۔ اس سے دنیا جل کر خاکستر ہو جائے تو کوئی بات نہیں، اسے[1] تو اپنی گوشت کی بوٹی بھونی ہے۔ وہ مشین کی آنکھ کھول کر زمین، فضا اور فلک دیکھنے پر آیا ہے تو آئندہ ایام میں اپنی نہیں اپنے استعمار کی ادا دیکھنے لگ گیا ہے۔ اس کی مشتِ خاک وسعتِ افلاک پر چھاتی چلی جا رہی ہے اور وہ اس جہانِ کاف و نون کو برباد کرنے پر پوری طرح آمادہ نظر آتا ہے۔ یہ بہر حال نظر کا فریب ہے۔ اس جہان کو زیر و زبر کرنا امریکہ کے بس کا روگ تھا نہ ہو سکتا ہے۔ بقول اقبالؒ (بادنیٰ تغیر) ؎

فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
"امریکہ" کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

سرعت سے بدلتا مزاجِ روزگار گواہ ہے کہ امریکہ اپنی حرکات سے اپنا روزِ حساب قریب تر لا رہا ہے۔ جو فیصلے بحر و بر و فضا میں ہوتے ہوتے رہ گئے وہ خلا میں پہنچ کر قطعی طور پر طے پا جائیں گے اور دنیا استعمار کی لعنت سے پاک اور صاف ہو جائے گی۔ یہ ساری تیاری اس "مطلع الفجر" کے لئے ہے جو آدم کے لئے ہنگامِ نمود کا پیغام ہوگا۔ اس وقت "ملائکہ اور الروح" (قوائے فطرت اور وحی آسمانی) کا نزول ہمہ دوش ہوگا اور نظامِ ارضی نئی اقدار کے تابع کار فرما ہوگا۔ اس وقت "من کل امرٍ سلام" کی نشید جانفزا ہر ابلیسی قوت کے لئے پیغامِ موت ہوگی۔

[1] وہ مردہ!

نقد و نظر

(SEVENTEEN SEPTEMBER DAYS)

پاکستان کی تاریخ میں ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ایک ایسا عظیم واقعہ ہے جس کی اجمالی یاد ہی نہیں بلکہ اس کے تفصیلی تذکرہ کا باقی رکھنا بھی ہمارا ملی بلکہ دینی فریضہ ہے۔ لہٰذا اس جہت میں ہر کوشش مستحقِ تحسین ہوگی۔ زیرِ نظر مرقع اسی اہم سلسلہ کی ایک محکم کڑی ہے جس میں ان سترہ دنوں کے واقعات کو (جو درحقیقت سترہ صدیوں پر بھی بھاری ہیں) حسین ترتیب کے ساتھ مدون کیا گیا ہے۔ کتاب کے مؤلف محترم عزیز بیگ صاحب حلقۂ طلوعِ اسلام میں پہلے سے متعارف ہیں۔ وہ ایک کہنہ مشق صحافی اور فولاد دستم اہلِ قلم ہیں۔ اور جب بھارت اور پاکستان کی کشمکش کا سوال سامنے آتا ہے تو ان کے قلم کی جولانیاں حدود ناآشنا ہو جاتی ہیں۔ ان کی یہ تمام خصوصیات زیرِ تبصرہ تالیف میں جھلمل جھلمل کر کے سامنے آجاتی ہیں۔ کتاب کے آخر میں نامور شہدائے پاکستان اور غازیانِ ملت کا تعارفی تذکرہ دیا گیا ہے، نیز وہ خراجِ عقیدت بھی جو دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر نے ان کی بارگاہ میں پیش کیا ہے۔ یہ معلومات افزا تالیف اس قابل ہے کہ اسے خود بھی پڑھا جائے اور آنے والی نسلوں کے لئے سنبھال کر بھی رکھا جائے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا ۱۹۶۹ء میں۔ طباعت دیدہ زیب ہے اور عکسی تصاویر سے مزین۔ جلد اور گردپوش حسین اور معنی خیز۔ قیمت چوبیس روپے۔

شائع کردہ: بابر اینڈ عامر پبلیکیشنز - ۱۸ - ۲ - گلبرگ - لاہور

---

۲ - زندگی کی راہیں - قرآن میں

مقامِ صد تشکر ہے کہ ہمارے اہلِ علم حضرات نے اب قرآن کریم پر غور و فکر بھی ضروری سمجھا ہے اور اس سرچشمۂ ہدایتِ ابدی سے، زندگی کی راہیں تلاش کرنا شروع کر دی ہیں۔ زیرِ نظر تالیف اسی کوشش کا ایک نتیجہ ہے۔ قاضی عبد النبی کوکب۔ ایم۔ اے، ایک عرصہ سے درسِ قرآن کریم دیتے چلے آرہے ہیں۔ انہوں نے (خود ان کے اپنے الفاظ میں) "قرآن حکیم کی مختلف سورتوں سے چند ایک ایسی آیات چن لیں جن میں انسانی زندگی کے لئے عمل کی راہیں متعین اور واضح کی گئی ہیں۔ جن میں حقوق کی نگہداشت اور معاملات کی اصلاح کی طرف بلایا گیا ہے .... اس طرح اپنی نوعیت کا یہ ایک مختصر نصاب۔ قرآنی ترتیب پا گیا"۔ اسے انہوں نے اپنے درس کا موضوع قرار دیا اور سامعین کرام میں سے دو حضرات --- محمد حنیف غازی اور قاضی اے مصطفیٰ کامل --- نے درس کے نوٹس سے اس کتاب کو مرتب کر دیا۔ کوکب صاحب کا اندازِ بیان سلجھا ہوا ہے لیکن قرآن فہمی کا رنگ وہی قدامت پرستانہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی غلط تعلیم پیش کرنے سے جو اعتراضات قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقے کے دل میں ابھرتے ہیں ان کا کوئی جواب اس کتاب میں بھی نہیں دیا گیا۔ کوکب صاحب ایسے مقامات سے یونہی سرسری آگے بڑھ گئے ہیں۔

کتاب نہایت عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ اور جلد بڑی خوبصورت ہے۔ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ

شوکت برادرز - اردو بازار - لاہور - اور - ناہد منزل - بیری کی سٹریٹ - لاہور

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

طلوعِ اسلام کنونشن کا مقالہ

"اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے" کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اس اجلاس کا جس قدر شوق ہوتا ہے، اس محفل کا جس قدر بے تابی سے انتظار ہوتا ہے، اسی قدر اس سے خوف بھی آتا ہے کہ یہاں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔

کچھ کہنے کے لئے آپ حضرات کے سامنے آتے ہوئے اپنی کم علمی کا احساس بار بار دامن پکڑ لیتا ہے لیکن پھر خیال آتا ہے۔ ع

امیر جمع ہیں احباب، دردِ دل کہہ لے

آپ کے خلوص سے حوصلہ پاکر اپنا دردِ دل آپ تک پہنچانے آجاتا ہوں۔

اس دور کے مسائل نے، جب کبھی پرانے اعتقادات کے معبدوں پہ یلغار کی نگاہیں منبر و محراب کی طرف اٹھیں مگر عبا و عمامہ کی بزرگی نے عقل و خرد کو ماؤف کرکے اس طوفان سے بے خبر ہوجانے، اسکے وجود ہی سے بے نیاز ہوجانے کی ترغیب دی، کسی نے اس طوفان کی شدت اور گہرائی کو محسوس کرکے اس کے مقابلے کے لئے ہتھیار مہیا نہ کئے۔

ابالیسِ عصرِ حاضر نے عقل و خرد کو ورغلایا کہ اس کا علاج ہمارے پاس ہے، پرانے مذاہب کے پاس نہیں، مگر اپنے اس یقین کو کیا کہوں، دل نے کہا۔ نہیں! انسان جن تاریک گزرگاہوں کے پیچ و خم میں کھو گیا ہے اس کا علاج عصرِ حاضر کے پاس کہاں، وہ تو خود خوار و زبوں سکونِ قلب ڈھونڈتا پھر رہا ہے، وہ تو خود بے یقینی کے دھندلکوں میں گم ہے، ان تاریکیوں سے نکلنے کے لئے راہ تو اسی آنکھ کو نظر آسکے گی جسمیں خاکِ حجاز کے ذرے آفتاب و ماہتاب بن کر چمک پیدا کر رہے ہوں گے ــــــ اور وہ آنکھ اٹھے گی

اسی ابدی ہدایت کی طرف، جو خدا نے اپنی آخری کتاب میں محفوظ کر دی ہے ــــ زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے، پہلا خیال یہی ہوتا ہے کہ اس کا جو حل یہاں سے ملے گا وہی اصل حل ہوگا۔

ایسے ہی مسائل میں روٹی کا مسئلہ اور حکومت کا مسئلہ بھی ہے اور ہمارے ہاں یہ دونوں مسائل اہم سے اہم تر ہوتے جا رہے ہیں، ان پچھلے چند سالوں میں ارباب اختیار اہل علم و دانش سبھی نے اسکے متعلق کچھ نہ کچھ کہا، سوشلزم اور فری انٹرپرائزز کی بحث بڑے زوروں پر رہی اور جمہوریت کی پکار ملک گیر نعرہ بن رہی ہے۔

پاکستان بنانے کی جدوجہد میں ہر کسی نے اپنے اپنے خوابوں کا عکس اس نئی مملکت میں ڈھونڈا، مگر ایک بات پہ سب متفق تھے کہ ہمارا طرزِ زندگی، ہماری معاشرت، ہماری معیشت، نہ سرمایہ دارانہ ہوگی اور نہ ہی مارکسی اشتراکی۔ ہمارا اپنا ایک جداگانہ طرزِ زندگی ہے جسے ہم اسلامی طرزِ زندگی کہتے ہیں اور جسے متشکل کرنے کے لئے ہم یہ خطۂ زمین مانگ رہے ہیں۔ کیونکہ خطۂ زمین کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں کیا جا سکتا ــ اور اسلام ایک دین ہے، مذہب نہیں، ایک طرزِ زندگی ہے، پوجا پاٹ کا مجموعہ نہیں۔ محض چند رسوم پوری کرنے سے اس کے تقاضے پورے نہیں ہو جاتے، یہ تو ساری زندگی پر محیط ہے۔ اس کے لئے ساری کی ساری زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے۔ اگر چند رسوم ادا کرنے سے اس کے تقاضے پورے ہو جاتے، تو علامہ اقبالؒ کبھی یہ نہ کہتے ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہم نے اسلام کو حقیقی معنوں میں آزاد کرانے کے لئے یہ خطۂ زمین لیا۔ اور اس کے بعد ــــ یہ بیس برس گواہ ہیں کہ ہم نے اس سلسلے میں کیا کیا، بیس سال کی اس مسافت میں ہم نے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے، ہم نے دنیا کو کس نظام کا نقشہ دکھایا۔ اشتراکیت کو ہم نے خدا سے بیگانہ قرار دے کر خارج از بحث کر دیا، اسلامی طرزِ زندگی کے نعرے لگاتے رہے مگر عملاً سرمایہ پرست نظام کو ملک میں جاری و ساری کیا۔ وہی زمینداریاں، وہی صنعتیں، وہی اجارہ داریاں،

ہمارے ہمسائے میں ایک اور ملک ہم سے بعد آزاد ہوا، مغربی استعمار اور اس کے حاشیہ برداروں سے اس نے ہم سے بعد چھٹکارا حاصل کیا اور اس نے بھی ایک نظریاتی مملکت کی تشکیل کی۔ اور آج ۱۰ سال بعد زندگی کے ہر شعبے میں، اس نظام کے فلسفے کی عملی تشکیل کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ کوئی اسے پسند کرے یا نہ کرے، یہ الگ بات ہے۔ مگر وہ اپنے نظریات کے پکے نکلے۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور دنیا کو دکھا دیا کہ

ایک دبا ہوا، پسا ہوا ملک، جسے افیون کی لت ڈال دی گئی تھی، کس طرح ایک نظریئے کے سہارے دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے، نہ صرف زندہ ہو سکتا ہے بلکہ دوسروں کو زندگی کی راہ دکھا سکتا ہے۔

— اور ایک ہم ہیں، کیا کہوں وہی بات ہے، ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

کیا ہمارے نظام کو دیکھ کر کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اور اگر نظریاتی ہے تو وہ نظریہ، وہ فلسفہ کیا ہے؟ کیا بیس برس معمولی عرصہ ہے؟ اگر ہمیں یہی نظام متشکل کرنا تھا تو کم از کم ہمیں اسلام کا نام لینا تو چھوڑ دینا چاہیئے تھا۔ دنیا یہی سمجھے گی کہ اسلام یہی نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں امیر اور غریب میں یہ تفاوت ہو گی۔ ایک طرف سر بفلک عمارتیں ہوں گی، دوسری طرف نالوں کے کنارے کاغذی جھونپڑیاں، جو ہوا میں اڑ جائیں، جو پانی میں بہہ جائیں، جو بارش کی تاب نہ لا سکیں۔ ایک طرف دولت کی ریل پیل ہو گی، برق رفتار گاڑیاں ہوں گی، دوسری طرف دو وقت کی روٹی کے لئے جگر پاش مشقتیں۔ ایک طرف اثر و رسوخ کی بیساکھیوں کے سہارے ترقی کے سب راستے پاؤں کی گرد تو دوسری طرف TALENT کے ہوتے ہوئے ترقی کے سب راستے مسدود، ہر طرف رکاوٹیں جو ہمتوں کو پست اور حوصلوں کو شل کر دیں۔

نظامِ تعلیم بھی ایک عیاشی ہو گی جو صرف دولت مندوں کی دسترس میں ہو گی۔ غریب کے بیٹے کا جوہر ناامیدہ غنچے کی طرح نسیم سحری کے نہ ختم ہونے والے انتظار میں تھک کر مرجھا جائے گا، اس کا سینہ اس کی اپنی حسرتوں کا مدفن بن جائے گا۔

نظام جس میں غریب کے بچے علاج معالجے کی راہ دیکھتے دیکھتے اس جنت کی طرف سدھار جائیں گے جس کی نوید غریبوں کو منبر و محراب سے ملتی رہتی ہے، جسے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس چند روزہ دنیا کی خوشگواریاں ان سرمایہ داروں کے لئے ہیں تو کیا ہوا، اس ہمیشہ رہنے والی زندگی میں تو سب سرفرازیاں غریبوں ہی کے لئے ہوں گی۔ جو یہاں ایک روشن کوٹھڑی کی تمنا لئے زندگی کاٹ رہا ہے۔ اسے اگلے جہان میں سونے کے محلوں کے تصور سے بہلایا جاتا ہے۔

خوشحالی کو عوام تک پہنچانے کے دعوے دار غریبوں کو صبر کی تلقین کے ساتھ ساتھ یہ فلسفہ بھی سناتے رہتے ہیں کہ نفع کی کشش ہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو کام پر اکساتا ہے۔ یہ INCENTIVE چھن جاتے تو جدوجہد ختم ہو جائے گی، لوگ تگ و دو بند کر دیں گے، زندگی پر جمود چھا جائے گا۔ سیاسی جماعتوں کے فلسفہ دان پکارتے رہے کہ اگر حکومت ان چیزوں کو اپنی تحویل میں لے لے، اگر زمین پہ "ذرائع پیداوار" پر حکومت قبضہ کرلے تو

پر شخصی آزادی پر بہت بڑا حملہ ہوگا، مارکسی نظام کی نقالی ہوگی۔ فرد کی آزادی اور اس کی نشو و نما ختم ہو جائے گی وہ سٹیٹ کے ہاتھوں ایک کھلونا، ایک غلام یا ایک مشین بن کر رہ جائے گا، اسلام یہ نہیں چاہتا۔ اسلام فرد کی نشو و نما پہ زور دیتا ہے!

یہاں آکر ذہنوں میں ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے!

فرد اور فرد کی آزادی اور مروجہ اشتراکی نظام میں فرد کی بے بضاعتی سب لوگ جانتے ہیں اور پھر یہ حقیقت بھی سب کو سامنے نظر آتی ہے کہ اس دور میں جہاں ایک شخص نے ایک کارخانہ لگایا تھا وہ تھوڑے ہی عرصے میں دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے کارخانوں، انشورنس کمپنیوں، بنکوں کا مالک بن گیا، جس ٹرانسپورٹر نے ایک بس سے کام شروع کیا تھا بہت جلد بسوں کا فلیٹ بنا لیا۔ اس کی وجہ اس نظام والے یہی بتلاتے ہیں کہ اس نے محنت کی، "نفع کی مہمیز اسے زیادہ" اور زیادہ کام پر اکساتی رہی، یہی اس کے کاروبار کی وسعت کا باعث بنی ـــ اور اس کے مقابلے میں دیکھا گیا کہ حکومت کے زیر انتظام شروع کئے گئے کارخانے آہستہ آہستہ غیر نفع بخش کام قرار دے کر شخصی تحویل میں دے دیئے گئے، پی آئی ڈی سی کے کئی کارخانے مثال ہیں ـــ اور شخصی تحویل میں یہی کارخانے منافع بخش کاروبار میں تبدیل ہو گئے ـــ

گورنمنٹ کی ٹرانسپورٹ بسیں ہمیشہ یہی سنتے رہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں آتی رہیں مگر اسی حساب سے ردی کے کھاتے میں "UNSERVICABLE" ہو کر ختم ہوتی رہتی ہیں کیونکہ ان کی نگہداشت اس لگن سے کوئی نہیں کرتا، بلکہ کام کرنے والے اپنی بے احتیاطی اور بے توجہی سے معمولی خرابیوں کو بڑی بڑی خرابیوں میں تبدیل کرنے کا موجب ہو جاتے ہیں صرف اس لئے کہ ان کا ذاتی نفع یا نقصان درمیان میں نہیں ہوتا۔

بظاہر بات بڑی درست معلوم ہوتی ہے، روزمرہ کا مشاہدہ اس کی تصدیق کرتا ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں FALLACY نظر آ جائے گی۔

ذاتی تحویل والا کارخانہ اس لئے ترقی کرتا ہے کہ مالک ہر وقت ذاتی کاوش سے کاروبار کو بڑھانے پر توجہ دیتا ہے، اس کا اپنا مفاد دوسروں کے مفاد کو پس پشت ڈال کر بھی ترقی کی راہیں اختیار کرنے پر مجبور رہتا ہے۔ اس کے برعکس، حکومت کی تحویل میں دیئے گئے کارخانے کی انتظامیہ بے دلی سے ایک روٹین پوری کرتی رہے جاتی ہے اس کاروبار کی توسیع میں اس لئے دلچسپی نہیں ہوتی کہ اس سے اس کی تنخواہ میں اضافے کا کوئی امکان نہیں ہوتا، بلکہ اس کا عملہ کارخانے کے نہیں، اپنے ذاتی مفاد کے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور یہ مفاد ان لوگوں سے پورا کیا جاتا ہے جو اپنے کام کے سلسلے میں اس کے دست نگر ہوتے ہیں ـــ اور یوں کارکردگی نہیں رشوت پرورش پاتی رہتی ہے۔

رشوت کے احتساب کے لئے ایک محکمہ قائم کیا جاتا ہے مگر اس سے رشوت میں اضافہ ہوتا ہے، پھر اس احتساب پہ ایک اور احتسابی محکمہ بنایا جاتا ہے مگر 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کے مصداق یہ برائی بڑھتی جاتی ہے اور اب ہماری سماجی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں یہ لعنت کارفرمانہ ہو ـــــ اور ہمیں اس کو ختم کرنے کی راہ سجھائی نہیں دیتی اور ساتھ ہی ساتھ ہم فری انٹرپرائز والوں کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔

اس لعنت کو ختم کرنے کا ایک راستہ افراد کی ذہنی تربیت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی راستہ محکم تر راستہ ہے یہی آئیڈیل راستہ ہے، اسلام بالغ نظروں کی ایسی سوسائٹی کی تنظیم کرتا ہے جس میں از خود ہر کوئی احکام خداوندی کا اس قدر پاس کرے کہ اسے کسی دوسرے کا حق مارنے یا ضرورت سے زیادہ رکھنے یا جمع کرنے سے روکنے کے لئے قانون استعمال ہی نہ کرنا پڑے۔ لیکن اس دور میں جب آسائشوں کے لئے نہیں بنیادی ضروریات کے لئے بھی جائز کمائی کافی نہ ہو سکتی ہو ـــ جہاں ناجائز کاموں کے لئے نہیں 'جائز حقوق کے حصول کیلئے بھی رشوت و سفارش کی بیساکھیوں کی ضرورت پڑے۔ ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت سوسائٹی میں بلند مقام اور عزت و تکریم کا موجب ہو سکتی ہو تو ایمان قائم رکھنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں رہتی ـــ اور ویسے بھی یہ رستہ بلاشبہ کٹھن، طویل اور ہمت آزما ہے۔

ـــ اور دوسرا رستہ؟ ـــ لیکن اس لعنت کو ختم کرنے کی تجاویز سے پہلے ہم اس بات پر غور کر لیں کہ جسے ہم فری انٹرپرائز، کھلی معاشی آزادی کہتے ہیں، کہاں تک آزاد ہے؟ اور کس کے لئے ہے؟

کیا یہ حقیقت نہیں کہ نچلا طبقہ اور متوسط طبقہ، اونچے طبقے، کارخانہ داروں، تجارتی اجارہ داروں کے مقرر کئے ہوتے نرخوں پر ہر چیز خریدنے پر مجبور ہے، کسی چیز کی قیمت کے تقرر میں ان کا کوئی اختیار نہیں ـــ اور جن کو یہ نرخ مقرر کرنے کا اختیار ہوتا ہے وہ اُن کی کسی مجبوری کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا ہی ان کی تنہا پالیسی ہے تاکہ یہ لوگ ہمیشہ ان کے محتاج رہیں، ہمیشہ اپنی ضروریات کے لئے ترستے رہیں۔

خریداروں کا یہ طبقہ قوم کا ننانوے فیصد نہیں تو کم از کم نوتے فیصد تو ضرور ہوتا ہے جو چادر کی تنگی دیکھ کر ٹانگیں پیٹ سے لگائے لگائے زندگی گزار دیتا ہے ـــ اور وہ ایک فی صد جو قیمتیں مقرر کرنے میں آزاد ہو وہ کیا ساری دولت اپنے پاس رکھنے کے لئے آزاد ہے؟ اس طبقے کے کسی آدمی سے پوچھ کر دیکھ لیجئے، وہ ٹیکسوں کی بھرمار کا شاکی ہوگا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ ساری آمدنی وغیرہ کا سچا حساب دکھائیں تو ان کے پاس اتنی دولت کبھی اکٹھی نہ ہو سکے۔ ان کی آمدنی کا اکثر حصہ سرکاری خزانوں میں جمع ہو جائے ـــ

پھر یہ دولت کیسے جمع ہوتی ہے؟ غلط حسابات دکھلانے سے ان غلط حسابات کو ہنرکارانہ انداز میں تیار کرنے والوں کی مدد حاصل کر کے سرکاری اہل کاروں کو اسے درست مان لینے پر رضامند کرنے کی ترکیبیں کرنے سے، اور یہ سب کارگزاری ان کے لئے دردِ سر بن چکی ہے۔

تو مختصراً صورتِ حال یہ ہوئی کہ اپنے ہی ملکی بہن بھائیوں کی ضروریات سے بے پرواہ ہو کر ان کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھا کر کمائی ہوئی دولت UNDERHAND MEANS سے ہی اپنے پاس جمع کی جا سکتی ہے ——

کیا یہ نظام لوگوں کو ایک طرف ظالم، بے رحم اور دوسری طرف چور، بے ایمان، دھوکا باز نہیں بناتا؟

سرمایہ دارانہ کھلی معاشی آزادی کے حامل نظام کے علمبردار اس بات پر بڑے خوش ہوتے ہیں کہ اس میں ایک خاص حد سے کم کمانے والے پر کوئی ٹیکس نہیں ہوتا۔ کیا یہ درست ہے؟

کم سے کم آمدنی والا، ایک غریب مزدور، ایک چھابڑی فروش، ایک بوجھ ڈھونے والا، جب شام کو گھر لوٹتا ہے تو دیکھتا ہے کہ گھر میں روشنی نہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ لیمپ میں تیل ختم ہے، تیل لاتا ہے تو کیا اس تیل پر کئی قسم کے ٹیکس نہیں۔ یہ ٹیکس کیا تیل کمپنی نے ادا کئے ہیں، تیل کے ڈپو والے نے، تیل بیچنے والے دکاندار نے ادا کئے ہیں؟ —— نہیں! بلکہ یہی ٹیکس اس کی قیمت بڑھاتے رہے۔ حتیٰ کہ اس کی مارکیٹ پرائس مقرر ہوئی جو تمام تر خریدار کی جیب سے نکلتی ہے۔ چاہے وہ افسر ہو یا مزدور۔

یہی حال دوسری ضروریاتِ زندگی کا ہے، کیا یہ تسلّی کہ غریبوں پر ٹیکس نہیں ہوتا، طفل تسلّی نہیں؟

متوسط طبقے کے لوگ، امرا کی دیکھا دیکھی، اپنا معیارِ زندگی اونچا کرنے کے لئے دولت کی خاطر ناجائز ذرائع کو اپناتے ہیں اور موجودہ دور میں کچھ لوگ ضروریات کے لئے بھی اس پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

رہنے کے لئے گھر ایک بنیادی ضرورت ہے، اس طبقے کے لئے اپنا مکان، اپنی جائز آمدنی میں سے اگر کبھی ممکن بھی ہو سکتا ہے تو معمولی حیثیت کا، عمر کے آخری دور میں —— تو اس سے پہلے جب وہ کہیں بڑا سفید پوش، کہیں بڑا باعزت، اور کہیں بڑا پڑھا لکھا بنا پھرتا ہے، کیا کرے۔ کرائے آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ اور مناسب حیثیت کا مکان کرائے پر لے کر بچوں کے لئے اچھا ماحول مہیا کرنا ممکن معلوم نہیں ہوتا۔

مکان کے بعد کپڑا ہے۔ سب کو صاف ستھرا سادہ کپڑا مہیا کرنے سے پہلے ہی، ڈیکرون اور ٹیریلین اور دوسرے نفیس کپڑوں کی تیاری کی ذہنیت کو کیا کہا جائے، کہ سادہ کپڑوں سے ستر چھپانے کے مقابلے میں نئے نئے سے پرنٹ میں نفیس سے نفیس کپڑے میں اپنے آپ کو نمایاں کرنا بڑے لوگوں کی ریت معلوم ہوتی ہے۔

بھی مہوتیں ہیں ـــــ دکھ سکھ، بیماری ہر انسان کے ساتھ ہے۔ ہمارے ہاں یہ بنیادی ضرورت بھی عام آدمی کی دسترس سے باہر ہے، ہسپتالوں کا جو ماحول ہے وہاں جانے کے خیال سے ہر سفید پوش کا دل کانپ جاتا ہے اور وہ خدا سے یہ دعا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ خدا اسے محفوظ ہی رکھے تو اچھا ہو۔

اور پھر تعلیم ہے ـــــ ہمارے ہاں تعلیم اس قدر مہنگی ہے کہ اچھے ماحول میں، اچھے سکول میں تعلیم دلوانا ایک عام آدمی کے بس کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ خاص طور پر جب تعلیم حاصل کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں۔

بڑھاپا ہے، معذوری ہے ـــــ جن کے لئے کچھ سامان کر کے رکھنا ہوتا ہے۔ ان بنیادی ضرورتوں کیلئے جن کے بغیر زندگی گزاری ہی نہیں جا سکتی۔ بسا اوقات ناجائز راستوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے ـــــ!

کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ بنیادی ضروریات ہر شخص کو بہم پہنچانے کی ضمانت دی جائے۔ یہ ضروریات اُسے بہم پہنچائی جائیں اور پھر دولت جمع کرنا، جائیداد کھڑی کرنا، اس کے لئے قانوناً منع کر دیا جائے۔

ممکن ہے یہ کچھ نازک طبائع پر گراں گزرے مگر ایسے قانون کا نفاذ کسی صورت بھی ظلم قرار نہیں دیا جا سکتا، جس قانون کی رُو سے قوم کے نوے فی صد انسانوں کے حقوق ان کو دلائے جا رہے ہوں، جو قانون باقی دس فی صد کو بھی ظالم اور چور بننے سے بچا رہا ہو، جو قانون اس دنیا میں متوازن معاشرے کے قیام اور دوسری دنیا میں سرخروئی کا باعث بنتا ہو، اس قانون کو کسی بھی معیار سے جانچا جائے تو اسے بے انصافی نہیں کہا جا سکتا ـــــ اور مسلمانوں کے لئے، جنہیں اپنی ضرورت سے زائد سارے کے سارے مال کو ضرورتمندوں کے لئے کھلا رکھنے کی تاکید ہے، جہاں مال کو گن گن کر، باندھ کر رکھنے والوں کو دردناک عذاب کی وعید ہے ـــــ اور دولت کو اونچے طبقے میں گردش کرتے رکھنے سے باز رہنے کی تلقین ہے ـــــ ایسے قانون کا نفاذ عین انصاف ہے۔ ان لوگوں نے از خود اس ملک کا قیام اسلام کے نام پر چاہ کر خود اسلام کی شہریت قبول کر کے اپنے اوپر یہ ذمہ داری عائد کر لی تھی، اور ایسے قانون کا نفاذ ان کی اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ تصور کیا جائے گا۔

یہ بات سرکاری ملازمین سے شروع کی جا سکتی ہے

اور جب سرکاری ملازمین کے لئے یہ سہولتیں فراہم کر دی جائیں گی ـــــ سرکاری ملازمین کو اب بھی تو سہولتوں کے نام پر ایئر کنڈیشنڈ کمرے اور ہیٹر اور ایسی دوسری چیزیں مہیا کی جاتی ہیں، تو کیوں نہ انہیں یہ سب بنیادی سہولتیں دے دی جائیں، اس صورت میں وہ یقیناً اپنے فرائض زیادہ دیانت داری سے انجام دیں گے، ٹیکس لینے والے ٹیکس چوری نہ ہونے دیں گے، انجینئر معیاری میٹریل کے بغیر کوئی عمارت یا سڑک پاس نہ کریں گے

قانون والے کسی سے رعایت نہ برتیں گے، اس سے کاروبارِ حکومت یقیناً بہتر ہو جائے گا۔

اور جب بڑے بڑے تاجروں، کارخانہ داروں کا ۸۰ فی صد روپیہ سرکاری خزانے میں جانے لگے گا تو ان میں سے بہت سے اپنی بنیادی ضروریات کے بدلے میں مزید ۱۰ فی صد حکومت کو حوالے کر کے یہ سہولتیں حاصل کرنے کو ترجیح دیں گے ـــــ اس وقت تک کے لئے لازم ہوگا کہ حکومت ان کارخانہ داروں کو یہ بنیادی سہولتیں اپنے ملازمین کے لئے فراہم کر کے دینا لازمی قرار دے دے ـــــ یعنی مکان، کپڑا، تعلیم، طبی سہولتیں اور روٹی کے لئے مناسب WAGES ـــــ اور جب حکومت کے کارندوں پر پہلے ہی اوپر بتائی گئی شرط نافذ ہو چکی ہوگی، تو یہ لوگ یقیناً ان سرمایہ داروں پر گریز اور فرار کی راہیں بند کر سکیں گے۔

اور جب انسان کے ذہن کو اس معاش کے چکر سے نجات مل جائے گی، اس اطمینان سے کہ اسکی اور اس کے بال بچوں کی کوئی ضرورت کسی صورت رکی نہ رہے گی ـــــ اس خوف سے آزادی پر اس میں نئی سے نئی صلاحیتیں بیدار ہوں گی اور وہ اپنے اندر ہردم نیا عزم، نئی ہمت محسوس کرے گا اور اس کی یہ نو بیدار قوتیں اُسے علم و سائنس کے میدان میں کس مقام تک لے جائیں گی، یہ ابھی سوچا بھی نہیں جا سکتا ـــــ اور تو اور اسے موت کا خوف بھی نہ رہے گا، اور وہ زندگی کو شب و روز کے پیمانوں سے ماپنے پر مجبور نہیں ہوگا۔ اس وقت اس کے لئے زندگی صحیح معنوں میں "پیہم رواں، ہر دم جواں" ہوگی۔ اور قوم صدیوں کی مسافتیں سالوں میں طے کرے گی۔

یہاں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ پھر لوگ محنت کیوں کریں گے، جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اُن کی کوئی ضرورت رکی نہ رہے گی تو وہ تگ و دو کس لئے کریں گے، نفع کی، زیادہ روپے کی کشش نہ ہوگی تو انہیں کونسا جذبہ زیادہ کام پر اکسائے گا؟

کمیونسٹ ملکوں کے لئے یہی مرحلہ ایک ایسا نازک مرحلہ ہے کہ برزنیف کو مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اپنی نئی نسل کو جس نے لوٹ کھسوٹ، EXPLOITATION دیکھی نہیں، کیسے؟ کس جذبے کو بیدار کر کے نئی محنتوں پر اکسا سکتے ہیں ـــــ اور اسی الجھن سے مجبور ہو کر روس اور یوگوسلاویہ کو اپنے نظام میں تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ جن کے باعث وہ اپنے ساتھیوں کی نظروں میں تحریف پسند ہو گئے۔

یہیں سے کمیونزم کی شکست اور اسلام کی فتح کا آغاز ہوتا ہے، یہیں سے اس فلسفے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے جو ایک نظام کے پیچھے کارفرما ہوتا ہے۔ "جذبہ حکومتوں کے قانون نہیں دے سکتے، یہ تو فلسفے ہی کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔"

مروجہ کمیونزم اور سرمایہ داری نظام عملاً انسان کی زندگی کو حیات چند روزہ کی زندگی سمجھتے ہیں جو موت سے ختم

ہو جاتی ہے، اسی لئے انہوں نے انسان کی جسمانی ضروریات مہیا کر دینے ہی کو اپنے نظام کی معراج سمجھا۔

—— سرمایہ داری نظام میں تو SELF PRESERVATION کے حیوانی جذبے نے زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کے عمل میں اپنی تسکین ڈھونڈھ لی، چاہے اس کی وجہ سے وہ کتنا ہی ظالم، کتنا ہی بے درد، کتنا ہی بے حس بن گیا ہے مگر کمیونزم اس کے اس حیوانی جذبے کی بھی تسکین نہ کر سکا۔ اور اسی لئے ابتدائی دور گزرنے کے بعد انسانوں کو کام پر لگانے کے لئے اور ان کو دوسروں کے لئے محنت کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے سوائے ڈنڈے کے، سوائے ظلم و تشدد کے کوئی راستہ باقی نہ رہا!

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ انسان محض حیوان نہیں، وہ محض حیوانی سطح پر نہیں جیتا، وہ حیوان کے علاوہ کچھ اور بھی ہے ——!

ہمارے ہاں یہ پیٹ کا مسئلہ، رہائش کا مسئلہ، اور ایسے دوسرے مسائل محض ابتدائی مراحل ہیں؟ —— اصل سفر تو ان کے حصول کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ان سب کو تو محض اس لئے خوش اسلوبی سے نمٹانا ہے، یہ سب کچھ تو محض اس لئے کرنا ہے کہ انسان کو ان فکروں سے آزاد کر دیں تاکہ وہ اپنی ذات کی نشو و نما پر توجہ دے سکے جس کی نشو و نما پر اس کی آئندہ زندگی کا دار و مدار ہے —— اور ہمارا فلسفہ کہتا ہے کہ ذات کی نشو و نما لینے سے، سمیٹنے سے نہیں، اپنی محنتوں کے ثمرات دوسروں کے لئے کھلے رکھنے، دینے سے ہوتی ہے، کیونکہ جو کچھ وہ دیتے ہیں وہ بھی اپنے ہی لئے ہوتا ہے، اپنی ہی ذات کی نشو و نما کے لئے ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے قانونِ مکافاتِ عمل ہے، حساب کتاب ہے، جزا اور سزا ہے، اس کی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس کے لئے تیاری ہماری اسی زندگی میں کرنی ہے، یہیں سے ہم نے آگے کے لئے بھیجنا ہے۔

اس فلسفے کو عام کرنے، ان باتوں کو ذہن نشین کرانے کے لئے ایک نئے نظام کی ضرورت ہوگی جہاں جامعوں میں محض اسلامیات کا محض ایک پیریڈ نہ ہو —— بلکہ پوری کی پوری تعلیم اور تعلیمی زندگی میں اس فلسفے کی روح جاری و ساری ہو —— اور دوسری نسل پر پہنچ کر جہاں کمیونسٹوں کی مشکلات کا آغاز ہوتا ہے، ہمارا کام زیادہ آسان ہو جائے گا، وہ نسل از خود ہی ایسا نیا دین کھڑی کر کے اپنے ذہنوں اور جسموں کے لئے مصیبتیں کھڑی کرنے کو بے کار جانے گی اور بنیادی ضرورتوں کے حصول کے بعد اپنے ذہن کے لئے آزاد و کھلی فضا کو ترجیح دے گی۔ اس وقت خود محنت کر کے، کما کے، دوسروں کی نشو و نما کے لئے، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے، دینے پر کسی کو کوئی مجبور نہیں کرے گا۔ اس سماج میں کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس دور میں تو کوئی زیردست نہیں ہوگا، کوئی مجبور نہیں ہوگا، کوئی اجیر نہیں ہوگا، کوئی حاکم نہیں ہوگا، کوئی محکوم نہیں ہوگا جس طرح

خدا کا قانون بیرونی فضا میں جاری و ساری ہے، اسی طرح انسانی زندگی میں بھی ہوگا۔ ان قوانین کے سامنے سب یکساں ہوں گے، برابر لائق تعلیم، قرآن کے لفظوں میں انسانیت کی متوازن اور اعتدال کے ساتھ بھرپور نشو و نما دینے کے لئے ایک دوسرے کے برابر کے ساتھی ہوں گے ــــ تعاونو علی البر والتقوی!

وہ ایک دوسرے کو تلقین کرتے چلے جائیں گے حق اور استقامت کی، حاکم اور محکوم کی طرح نہیں یا آج کے لیڈروں کی طرح دوسروں ہی کو تلقین نہیں ہوگی، خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں گے ــــ وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر!

اس قافلے کا ہر فرد اپنے پاؤں حق پر جما کر رکھے گا (وصبروا) اپنے ساتھیوں کے لئے ثبات کا باعث بنے گا۔ (صابروا) اور اس طرح باہوں میں باہیں ڈالے (رابطوا) قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے (واتقوا اللہ) یہ انسانیت کو اس کی گم گشتہ جنت کی نشان دہی کرنے میں کامیاب ہوگا۔ والسلام!

مسلمانوں کی تاریخ

کے متعلق تو آپ نے بہت سی کتابیں دیکھی ہوں گی لیکن خود اسلام کی تاریخ کیا ہے؟ یہ شروع میں کیسا تھا۔ پھر زمانے میں اس پر کیا گزری۔ اس میں کس کس قسم کی آمیزش ہوئی۔ اور بالآخر وہ کیا سے کیا بن گیا؛ اس قسم کی کتاب شاید آپ کی نظروں سے نہ گزری ہو ــــ مصر کے نامور مؤرخ

علامہ احمد امین

نے اس موضوع کو اپنی تحقیق کا مرکز قرار دیا۔ اور ایک سلسلۂ کتب شائع کیا ــــ اس سلسلہ کی پہلی کڑی

فجر الاسلام

ہے۔ ادارہ طلوع اسلام نے اس کا نہایت شگفتہ اردو ترجمہ دو حصوں میں شائع کیا ہے پہلے حصہ میں زمانہ قبل از اسلام سے لیکر عہد عباسیہ تک کے احوال و کوائف ہیں۔ اور حصہ دوم میں اس سے ملحقہ زمانہ کے حالات۔ یہ بڑی معلومات افزا اور حقیقت کشا کتاب ہے۔

قیمت۔ ہر حصہ چار روپے ــــ جلد فرمائش بھیجئے!

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی گلبرگ لاہور

کراچی میں جشنِ نزولِ قرآن

(لاہور کی طرح بزمِ طلوعِ اسلام کراچی نے بھی اپنے ہاں ۷ جنوری کو جشنِ نزولِ قرآن بہ تزک و احتشام منایا۔ اس تقریب پر بزم کے نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب نے حسبِ ذیل الفاظ میں سامعین سے تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف کرایا)

خواتین و حضرات!

بزمِ طلوعِ اسلام کراچی سالہا سال سے نزولِ قرآن کا جشن مناتی آئی ہے امسال بھی آج ہم اسی مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریبِ سعید پر قرآن کریم کے تعارف کے ساتھ ساتھ اس تحریکِ فکرِ قرآنی کا بھی مختصر سا تعارف پیش کیا جائے۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کی ابتدا ملک کی تقسیم سے قبل عمل میں آئی تھی۔ پاکستان کے حصول کے لئے طلوعِ اسلام نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، غیر منقسم ہندوستان کے رسالہ طلوعِ اسلام کے فائیل اسکی زندہ شہادت ہیں۔

چونکہ تحریکِ طلوعِ اسلام قرآن کریم کی روشنی میں علم و عقل کی رو سے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر قرآن کی بتائی ہوئی مستقل اقدار پر مبنی ایک اسلامی نظام کے قیام کا داعی ہے اسلئے قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک طلوعِ اسلام اسی مقصود و منتہٰے کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہے اور اس قلیل مدت میں اس نے قرآنی نظامِ حیات کے خدوخال کو نکھار اور ابھار کر پیش کرنے کی سعی و کاوش برابر جاری رکھی ہے۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کے نزدیک پاکستان کا استحکام نہایت ضروری ہے اسلئے کہ یہ خطۂ زمین ایک بلند نصب العین کے حصول کا ذریعہ ہے یعنی ملت کی وحدت اور قرآن کریم کی بنیاد پر صحیح اسلامی نظام کا قیام۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ ہی کسی مذہبی فرقے سے، نہ ہی اسکا کام ملک میں ہنگامے برپا کرنا ہے۔ یہ تحریک امت میں اتحادِ کلّی کی علمبردار ہے اور پوری نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنانے کی داعی۔ اس تحریک کا مسلک دلائل و شواہد اور علم و بصیرت کی رو سے قرآن کریم کی تعلیم کو اسطرح پیش کرنا ہے جس سے قلب و دماغ میں صحیح تبدیلی پیدا ہو جائے۔ کیونکہ اس قسم کی تبدیلی کے بغیر سیرت و کردار میں تبدیلی پیدا نہیں کیجا سکتی۔ چونکہ اس تحریک کی بنیاد ہی قرآنی حقائق پر استوار ہیں اور اسکا مقصد قرآنی نظام کی تشکیل ہے اسلئے اس تحریک کے عام کرنیکا ہم نے طریق بھی وہی اختیار کیا ہے جسے قرآن کریم تجویز کرتا ہے یعنی فکری طریقِ عمل۔ ہم بھی ہر ایک سے باتباعِ رسالت یہی کہتے ہیں کہ "اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ"

یں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ "اِنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَ فُرَادٰی" تم خدا کیلئے ایک ایک دو دو کرکے کھڑے ہو جاؤ" ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا " ۳۴/۴۶۔ اسکے بعد سوچو! اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا کہ انسانیت کی منزل کونسی ہے اور ہم کس راستے پر چلے جا رہے ہیں تو تم یقیناً قرآن کی دعوت سے متفق ہو جاؤ گے۔

تحریک طلوع اسلام قرآنی نظام ربوبیت کی پیامبر ہے۔ قرآنی نظام ربوبیت کیا ہے؟ ایک ایسے نظام کا قیام جس میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہو۔ چونکہ نظام ربوبیت صرف جسم تک محدود نہیں — انسان میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے یعنی اسکی ذات، انا، نفس، یا خودی — اسلئے نظام ربوبیت سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی تمام مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے تاکہ نوع انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے اور اسکے بعد کی زندگی میں شرف انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے جو اسکے خلاف ہے غلط ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ تمام نوع انسان کے لئے قیامت تک بلندی اخلاق و کردار کا بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) ہے جس کے اتباع میں شرف انسانیت کا راز پنہاں ہے۔

طلوع اسلام خلافت علی منہاج نبوت کے قیام کے لئے کوشاں ہے۔ خلافت علی منہاج نبوت میں تمام مسلمانوں کے لئے ایک قانون شریعت ہوتا ہے۔ مختلف فرقوں کے لئے مختلف قوانین نہیں ہوتے۔ اسمیں تمام مسلمان ایک امت کے افراد ہوتے ہیں فرقوں میں بٹے ہوئے نہیں ہوتے۔ رسول کریمؐ کے زمانہ میں امت میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ اسوقت مختلف فرقوں کے اپنے اپنے قوانین شریعت ہیں ان میں سے کوئی فرقہ کسی دوسرے فرقے کے قانون کو اسلامی قانون تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان حالات تمام مسلمانوں کے لئے واحد اور مشترک اسلامی قانون مدون کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ قرآن کریم کو قانون کی غیر متبدل بنیاد قرار دے دیا جائے۔ قرآن کریم کو بنیاد قرار دے کر مختلف فرقوں کی فقہ اور روایات کو سامنے رکھ کر ارباب علم و بصیرت کی مشاورت سے ایسا قانون مرتب کیا جائے جو ہمارے زمانہ کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اسکے سوا امت میں وحدت پیدا کرنے اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کی کوئی صورت نہیں۔

اس مقصد کے لئے طلوع اسلام کسی سے کچھ مانگتا نہیں۔ البتہ جو حضرات بطیب خاطر اس مقصد سے متفق ہوں وہ انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ اس فکر کی نشر و اشاعت کے لئے اس سے تعاون کریں۔

یہ ہے عزیزان محترم! تحریک طلوع اسلام کا مختصر سا تعارف۔ وقت کی قلت کے سبب میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ طلوع اسلام کیا کہتا ہے؟ یہ جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کے لئے یقیناً ان ہزار ہا صفحات پر مشتمل کتب کا مطالعہ ضروری ہے جو اس سلسلے میں محترم پرویز صاحب اور ادارۂ طلوع اسلام اب تک شائع کر چکا ہے جس میں خدا، ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، آخرت، نبوت، رسالت، معراج، وحی، الہام، مرکز ملت، جہاد،

جنگ، ابلیس، شیطان، جنات، ملائکہ، غلام، لونڈیاں، ترکہ، ورثہ، طلاق سے لیکر انسانی تخلیق، نظریۂ ارتقاء، احادیث، تاریخ اسلام، قرآن کا سیاسی، معاشی، معاشرتی اور عائلی نظام، قانون سازی کا اصول، موجودہ علوم و فنون کا قرآن کریم کے آئینہ میں جائزہ، مذاہب عالم پر تنقیدی نظر اور اسکے علاوہ صدہا دیگر اہم عنوانات پر تفصیلی مباحث شامل ہیں۔

جو تعارف برادرانِ عزیز! میں نے اب تک مختصر طور پر آپ کے سامنے پیش کیا یہ سنکر یقیناً آپ اس نتیجے پر پہنچے ہونگے، کہ اس قسم کی سائنٹیفک تحقیق اور تعلیم و تربیت نہ صرف مملکتِ پاکستان کے عوام کے قلب و دماغ کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہے بلکہ پوری نوعِ انسانی کو اس سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ یہ بھی سوچ رہے ہونگے کہ تدبر قرآن کی اس دعوت کی اتنی شدت سے مخالفت کیوں کی جا رہی ہے۔ آپ اس تردد میں نہ پڑیئے، میں مختصر طور پر اس کی بنیادی وجہ بھی آپ کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں۔

عزیزانِ گرامی! آپ دیکھینگے کہ آپ قرآن کریم کو صرف انفرادی وعظ و نصیحت کے طور پر پیش کریں تو اس کی مخالفت کہیں سے نہیں ہوگی۔ لیکن جب آپ اسے دین یعنی ایک اجتماعی نظام کی شکل میں پیش کریں گے، تو مخالفت کا ایک ہجوم چاروں طرف سے سیلاب بلا کی طرح امنڈ آئیگا۔ اسکی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قرآن خدا اور بندے کے درمیان کسی قوت کو حائل نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے محکم نظام کے ذریعے براہِ راست خدا کے قانون کی اطاعت سکھاتا ہے۔ اس سے نہ اربابِ شریعت کی خدائی مسندیں باقی رہتی ہیں نہ ہادیانِ طریقت کی الوہیاتی عظمتیں۔ ظاہر ہے کہ پیشوائیت کے علمبردار اسے کسی صورت گوارا نہیں کر سکتے۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ حضرات اپنے اس قسم کے اقتدار کو آسانی سے چھوڑ دیں جس کا تسلط جسموں کے بجائے دل و دماغ پر ہو۔ لوگ انہیں سجدے بھی کریں، نذرانے بھی پیش کریں، گالیاں بھی کھائیں اور پیر بھی دبائیں۔ کہیئے! اس قسم کی حکومت و سطوت اور عزت و عظمت کو کون آسانی سے چھوڑتا ہے۔ ایسے نظام کی طرف دعوت جس میں حکمرانی صرف خدا کے قانون کی ہو اس کے تصور سے بھی یہ کانپ اٹھتے ہیں۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ جب ان لوگوں کے سامنے، جو مستقبل کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے (اور جن کے پیش نظر صرف اپنا مفاد عاجلہ ہوتا ہے) تنہا خدا کا نام لیا جائے، یعنی ان سے کہا جائے کہ اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہے اور کسی کی نہیں تو ان کے دل غم و غصہ سے طلسم پیچ و تاب بنجاتے ہیں (۳۹/۴۵) اور خدا کے علاوہ اوروں کا نام لیا جائے تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ (۱۷/۴۶) تنہا خدا کا نام سنکر یہ نفرت و انتقام کے جذبات سے مغلوب ہوکر منہ پھیر لیتے ہیں۔

پیشوائیت کے علاوہ دوسرا طبقہ جو اس نظام کی شدت سے مخالفت کرتا ہے، وہ ہے مترفین کا طبقہ۔ وحی خداوندی کی رُو سے جو نظام زندگی قائم ہوتا ہے، اس میں نہ کسی مفاد پرست لیڈر کی لیڈری باقی رہتی ہے، نہ

کسی جاگیر دار کی جاگیرداری، نہ کسی کے پاس قارون کے خزانے رہتے ہیں، نہ شداد کا بہشت۔ اس میں اللہ کے عطا کردہ رزق کے سرچشمے اللہ کے بندوں کی ضروریات کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ تمام قوتیں جو رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھی رہتی ہیں، اس انقلابی آواز کو دبانے کے لئے متحد و منظم ہوجاتی ہیں جو قرآنی نظام کو متشکل کرنے کے لئے اٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے جب اور جہاں کوئی انقلابی آواز اٹھتی ہے یا اٹھے گی تو مترفین یعنی دوسروں کی کمائی پر پلنے والے طبقے کی طرف سے اس کی مخالفت سب سے پہلے ہوگی۔ ان دونوں گروہوں (یعنی مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ دار طبقہ) کا مسلک ہی دوسروں کی کمائی پر زندہ رہنا ہوتا ہے۔ (انقلاب کی یہ آواز علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی آواز ہوتی ہے) لہٰذا جب مذہبی پیشوائیت، ملوکیت اور سرمایہ داری کی سپر بن کر اس کے مقابلہ کے لئے میدان میں آجاتی ہے تو ان کے پاس اس کے تمام دلائل کا بس ایک جواب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ۴۳/۲۳ (ہم نے اسلاف سے ایسی کوئی بات نہیں سنی) اور جب وحیِ خداوندی کی طرف سے اس کا جواب دیا جاتا ہے (۴۳/۲۴) تو وہ عوام کے جذبات کو یہ کہہ کر مشتعل کرتے ہیں کہ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۲۶/۲۵ (کیا تم سنتے ہو کہ یہ تمہارے اسلاف کے متعلق کیا کہتا ہے)۔ نظامِ سرمایہ داری کے یہ مقدس محافظ یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں اور پھر اس انقلاب کی آواز بلند کرنے والوں کے خلاف ہر قسم کے کذب و افترا، تہمت تراشی اور دروغ گوئی سے کام لے کر عجیب و غریب من گھڑت باتیں انکی طرف منسوب کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن کی طرف جانے ہی نہ پائے۔

اس لئے برادرانِ عزیز! ان سنی سنائی افواہوں پر یقین نہ کیجئے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں — کہ طلوعِ اسلام کیا کہتا ہے؛ اس کے لئے آپ طلوعِ اسلام کی کتابوں، رسالے اور پمفلٹس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی معلوم کر سکتے ہیں۔ آپ اس لٹریچر کو خود پڑھیئے یا ادارہ طلوعِ اسلام سے دریافت کیجئے کہ فلاں معاملہ میں ان کا عقیدہ اور مسلک کیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں یقینی طور پر علم نہ ہو اسکے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو! تم سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے خود اپنے کانوں سے ایسا سنا تھا۔ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے ایسا دیکھا تھا اور یہ بھی پوچھا جائیگا کہ تم نے سمجھ سوچ کر اس کی تحقیق کر لی تھی اور خود تمہارے اپنے دل نے تو اس کے اندر کچھ نہیں ملا دیا تھا

یاد رکھیئے! طلوعِ اسلام اس دین کو عملاً متشکل کرنے کا داعی ہے جسے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ اگر آپ نے لوگوں کی باتوں میں آکر نادانستہ اس کی مخالفت کی تو یہ چیز خدا کی بارگاہ میں بہت بڑا جرم ہوگا۔

والسلام!

باب المراسلات

بیٹے کی فیس چھ روپے۔ باپ کی نو روپے۔

طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۵۶ء میں "اسلامیات کی تعلیم اور سیاست" کے عنوان سے "ایک شاہد عادل" کا جو مراسلہ شائع ہوا ہے وہ بڑا حقیقت کشا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے بی۔ اے سے کے اسلامیات کے نصاب میں سے کس طرح قرآن مجید کے ایک حصہ کو خارج کر کے اس کی جگہ جماعت اسلامی کی ایک تازہ تصنیف "اسلامی نظریہ حیات" کو داخل نصاب کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے خود حکومت کے خلاف کس قسم کا پروپیگنڈہ مقصود ہے اس کی وضاحت دو ایک مثالوں سے کی جاتی ہے۔ مثلاً

(۱) اس کتاب کے حصہ سوم میں "اسلام کا سیاسی نظام" سے متعلق مقالہ میں، تعلیم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ

> تعلیم ہر دور میں مفت رہی مسلمانوں نے ایک دن کے لئے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کو بھی فیس کے ساتھ وابستہ نہیں کیا۔ علم اور اونچے سے اونچے درجہ کے علم کے دروازے ہر شخص کے لئے بلا فیس کھلے رکھے۔ (ص ۱۰۹۔ حصہ سوم)

ظاہر ہے کہ اس سے طالب علموں کے دل میں اس زہر کا پھیلانا مقصود ہے کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں طالب علموں سے کبھی فیس نہیں لی جاتی تھی لیکن ہماری حکومت پاکستان، جو اسلامی مملکت کہلاتی ہے طالبعلموں سے فیس وصول کرتی ہے، اس قسم کی حکومت کس طرح اسلامی کہلا سکتی ہے؟ بات چونکہ خود طالب علموں سے متعلق ہے اس لئے ان کے دلوں پر اس زہر کا اثر ہو جانا لازمی ہے۔ لیکن آئیے۔ ہم آپ کو بتائیں کہ اسلام کی اس واحد اجارہ دار جماعت (اسلامی) کی اپنی حالت کیا ہے۔ انہوں نے اسلامی اصولوں کے مطابق تعلیم دینے کے لئے ایک ہائی سکول (نیا مدرسہ کے نام سے) کھول رکھا ہے۔ اس میں مفت تعلیم دینا تو درکنار، طالب علموں سے الگ فیس وصول کی جاتی ہے اور ان کے باپ سے الگ۔ مثلاً دسویں جماعت کے طالب علم سے چھ روپے فیس وصول کی جاتی

ہے اور نو روپے طالب علم کے باپ سے۔ چونکہ قانونی طور پر ایسا کرنا قابلِ گرفت تھا، اس لئے چھ روپے کی رسید تو "نیا مدرسہ" کی طرف سے دی جاتی ہے اور نو روپے کی رسید مجلس تعلیم اسلامی لاہور کی طرف سے بطور عطیہ کاٹی جاتی ہے۔ یہ دونوں رسیدیں ایک ہی کلرک، طالب علم کو دیتا ہے اسکے پاس دونوں رسیدیں بکیں موجود رہتی ہیں۔ میرے پاس ایک ہی طالب علم کی دونوں قسم کی رسیدیں موجود ہیں۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک ایسا کرنا کچھ معیوب نہیں ہو سکتا کیونکہ جب "زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے، جھوٹ بولنا اور فریب دینا شرعاً واجب سمجھ لیا جاتا ہے تو پھر ایسا نہ کرنا گناہ ہوگا۔

(۲) اب دوسری مثال سامنے لائیے۔ جب سے حکومتِ پاکستان نے سوشلسٹ حکومتوں سے اپنے روابط پیدا کرنے کی طرف قدم بڑھایا ہے جماعتِ اسلامی نے کمیونزم کے خلاف پراپیگنڈہ کو اپنا مخصوص پروگرام قرار دے رکھا ہے۔ بات ہے بھی ٹھیک ___ خرے دار و بجز پالاں گراو ___ اس سلسلہ میں، زیرِ نظر کتاب "اسلامی نظریہ حیات" کے حصہ اول میں، کمیونزم پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ان اعداد و شمار پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ یونانیوں کی ستم ریزیاں، ایرانیوں کی لشکر انگیزیاں اور چنگیز و ہلاکو کی قتل و غارت گری اس فہرست کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ (حصہ اول۔ صفحہ ۲۲)

میں خود کمیونسٹ نہیں، اور کمیونزم یا سرمایہ داری نظام پر تنقید کا حق ہر فرد کو دیتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ امریکی نظام نے جو قیامتیں کمزور اقوام پر ڈھا رکھی ہیں، کیا ان کی ستم ریزیاں، لشکر انگیزیاں اور قتل و غارت گری کی ہولناکیاں، ان سے کم ہیں؟ اب سوچئے کہ ان ستم ریزیوں کا تو کہیں ذکر نہ کیا جائے اور کمیونسٹ ممالک کے متعلق اس طرح اعداد و شمار پیش کرکے، یکطرفہ تصویر سامنے لے آئی جائے، کہاں کی دیانت ہے۔ اور اس لئے عین اس وقت جب حکومت پاکستان، ان کمیونسٹ ممالک سے روابط استوار کر رہی ہے طالبعلموں کے دل میں اس طرح کی زہر فشانی کیا نتیجہ پیدا کرے گی؟

یہ ہے جو کچھ "اسلامیات" کے نام سے ہمارے نوجوانوں کو خود ہماری اپنی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ ہم اپنے دورِ غلامی کا رونا رویا کرتے ہیں کہ غیروں نے ہمارے نوجوانوں کو غلط تعلیم دے کر کیا سے کیا کر دیا۔ لیکن سوچئے کہ خود ہم اپنے، ان بچوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟

از باغباں شد است کہ صیاد آں نکرد

والسلام!

"دوسرا شاہد عادل"

مطالبُ الفرقان

قرآن کریم کے انیسویں پارہ کے مطالب' اس سے پہلے طلوعِ اسلام کے تین شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ کو حلقۂ قارئین میں بے حد پسند کیا گیا ہے۔ چنانچہ اب انتیسویں پارہ کے مطالب شروع کئے جاتے ہیں۔ انہیں طلوعِ اسلام میں اس طرح چھاپا جاتا ہے کہ آپ چاہیں تو ادارہ رسالے سے الگ کر کے ان کی جداگانہ شیرازہ بندی کر سکتے ہیں تاکہ یہ آپ کے پاس محفوظ رہیں۔

سُورۃ المُلک (۶۷)

(۱) وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام کائنات کا اقتدار ہے' کس قدر فراوانیوں اور خوشگواریوں کی مالک اور ثبات و استحکام اور نشو و ارتقاء عطا کرنے کی ضامن ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ہر شے کے اندازے' اور پیمانے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں جن پر اسے پورا پورا کنٹرول ہے۔ (دنیا میں جو نظام اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوگا اس کی خصوصیت بھی یہ ہوگی کہ اس کا اقتدار نوعِ انسانی کے لئے موجبِ خیر و برکت ہوگا۔ اور اس اقتدار کا نفوذ قوانین کی رو سے ہوگا)۔

(۲) اس نے' کائنات کے ارتقاء کے لئے' متضاد عناصر میں کشمکش کا اصول مقرر کر رکھا ہے۔ اور یہی قانون' خود انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ جو فرد یا قوم کشمکشِ حیات میں تعمیری پہلو کو غالب رکھتی ہے' وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ جو اس کے خلاف چلتی ہے اس کی زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور یوں اس پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ خود انسان کی طبیعی موت بھی اس کی ذات کی صلاحیتوں

کے پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ (اگر اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو چکی ہے تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہے۔ اسے جنت کی زندگی کہتے ہیں۔ اگر اس کی نشوونما نہیں ہوئی تو وہ آگے بڑھنے کے قابل نہیں ہوگا یہ جہنم کی زندگی ہے۔ لہٰذا مومن کے لئے موت مزید ترقیوں کے راستے کا دروازہ ہے نہ کہ کوئی ڈرنے کی چیز) یہ ہے وہ خدا جو اپنے تمام پروگرام پر غالب ہے اور اُسے ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھتا ہے۔ (۶۷/۱ ؛ ۶۷/۲)

(۳)۔ (اگر تم دیکھنا چاہو کہ اُس کا پروگرام کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اور اس کی صفات ــ برکت وملک وقدرت کس حسن و خوبی سے بیک زمان کارفرما ہیں تو کائنات کی اس عظیم القدر مشینری پر غور کرو)۔ اس نے فضا کی پہنائیوں میں، مختلف کروں کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ (ان میں باہمی تصادم نہیں ہوتا)

تم یہاں سے وہاں تک دیکھ جاؤ، تمہیں خدائے رحمٰن کی بنائی ہوئی کائنات میں کہیں بے ترتیبی یا عدم تناسب نظر نہیں آئے گا۔ تم ایک بار نہیں، بار بار نگاہ کو لوٹا کر دیکھو، خوب جانچ پڑتال کرکے غور کرو، تمہیں کہیں کوئی دراڑ یا درز دکھائی نہیں دے گی۔ کوئی شے بے جوڑ یا اٹکل نہیں ہوگی۔

(۴) تم طائرِ نگاہ کو فضا کی پہنائیوں میں بار بار اذنِ بال کشائی دو اور اس سے کہو کہ وہ خوب اچھی طرح سے دیکھے کہ کائنات میں کہیں کوئی اختلال ہے۔ وہ ہر بار حیران و درماندہ، کاشانۂ چشم میں لوٹ آتے گا۔ اور اُسے کہیں اختلال دکھائی نہیں دے گا۔ (یہ ہے اُس کائنات کا نقشہ جس میں ہر شے ہمارے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اگر تم بھی اپنی دنیا میں ہمارا نظام قائم کرلو تو تمہارے معاشرہ میں کس طرح فساد کی جگہ اصلاح، اور اختلاف کی جگہ باہمی موافقت پیدا ہو جائے گی)

(۵) اور ہم نے اس فضا کو، جو تمہیں قریب تر نظر آرہی ہے، درخشندہ ستاروں سے مزین کر رکھا ہے۔ (یہ بھی تمہاری زمین کی طرح مختلف اجرام ہیں۔ لیکن) جو لوگ ہمارے قوانین کا علم نہیں رکھتے اور توہمات کی تاریکیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، وہ ان ستاروں سے قیاس آرائیاں کرکے، غیب کے حالات معلوم کرنے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ لیکن اب جو نزولِ قرآن کے بعد، علم و تحقیق کا دور آگیا ہے، تو یہ کاہن اور نجومی رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے۔ ان کی اٹکلیں بے کار ہو کر رہ جائیں گی۔ اور ان کا انجام بڑا ہلاکت آمیز ہوگا۔ (۶۷/۳ ؛ ۶۷/۴، ۵)

(۶) اور ایک انہی پر موقوف نہیں۔ جو لوگ بھی، زندگی کے کسی گوشے میں، قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ان کا انجام تباہی اور بربادی ہوتا ہے اور یہ بہت ہی بُرا انجام ہے۔

(۷) جب یہ لوگ تباہیوں کے جہنم میں ڈالے جائیں گے تو اس سے چیخ و پکار کی کرب انگیز آوازیں سنائی دیں گی۔ اور وہ (جہنم) بڑا پُر جوش اور طوفان انگیز ہوگا۔

(۸) ایسا طوفان انگیز کہ یوں دکھائی دے گا گویا وہ جوشِ غضب سے پھٹ جائے گا۔ جب کوئی قوم اس میں ڈالی جاتی ہے تو اس سے جہنم کے چوکیدار پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا شخص نہیں آیا تھا جو تمہیں تمہاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا؟

(۹) وہ کہتے ہیں کہ ہاں! ہمارے پاس ایسا آگاہ کرنے والا آیا تھا لیکن (ہماری بدبختی کہ ہم نے اس کی بات کو سچ نہ مانا) اس سے کہا کہ تو جھوٹ کہتا ہے۔ تیری طرف خدا نے کوئی وحی وغیرہ نہیں بھیجی۔ (اور جو لوگ اس کا اتباع کرتے تھے، انہیں الٹا طعن دیا کہ) تم بڑی گمراہی میں پڑے ہو (ہم بالکل ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں)

(۱۰) اصل یہ ہے کہ ہم نے عقل و فکر سے کام ہی نہ لیا۔ یونہی تعصب، ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید کی بنا پر اُن کی مخالفت کرتے رہے۔ اگر ہم بگوشِ ہوش ان کی بات سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے، تو آج اس جہنم میں کیوں ہوتے؟ (جہنم میں جاتا ہی وہی ہے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتا)۔ (۷:۱۷۹)

(۱۱) وہ اس طرح، عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر، اپنے جرائم کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا حاصل؟ جو (مہلت کا وقفہ ختم ہونے کے بعد) اپنے اعمال کے نتائج کے اعتبار سے دوزخ میں چلا گیا وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گیا۔

(۱۲) ان کے برعکس، جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، اپنے اعمال کے اَن دیکھے نتائج کو اپنی نگاہوں میں رکھتے ہیں، اور غلط اعمال کے عواقب سے خائف رہتے ہیں، ان کے لئے ہر قسم کی تباہیوں سے بچنے کا سامان ہے، اور ان کی محنتوں کے نہایت شاندار نتائج ہیں۔

(۱۳) لیکن یہ چیز اس طرح حاصل نہیں ہو سکتی کہ تم زبان سے ان قوانین کا اقرار کرتے رہو اور دل میں ان کے خلاف پروگرام بناتے رہو۔ اس طرح تم خدا کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم اپنے ارادوں کو ظاہر کرو یا مخفی رکھو، خدا کے نزدیک یکساں ہے۔ وہ تو دلوں کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے۔

(۱۴) ذرا سوچو کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اگر وہ بھی تمہارے دل کی باتوں سے واقف نہیں تو اور کون واقف ہوگا؟ اس کی نگاہ بڑی باریک بیں ہے اور وہ ہر بات سے باخبر ہے۔

(۱۵) اس خدا نے تمہاری نشوونما کے لئے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ رزق کے سرچشموں (زمین) کو تمہارے تابع تسخیر بنا دیا ہے۔ سو تم اس کے حصول کے مختلف راستے تلاش کرو۔ اور اس طرح اس کے عطا کردہ رزق کو اپنے استعمال میں لاؤ۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لو کہ تم ان رزق کے سرچشموں کے واحد مالک ہو اس لئے انہیں جس طرح جی چاہے

اپنے تصرف میں رکھ سکتے ہو۔ یہ تمہاری امانت میں دیئے گئے ہیں اس لئے تمہیں ہر وقت اس کا خیال رہنا چاہیئے کہ تمہیں خدا کو ان کا حساب دینا ہے۔ (یہی وہ انداز نگاہ ہے جس سے انسانیت کا شجرِ خزاں دیدہ از سرِ نو بہار سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔)

(۱۶) (تم جو رزق کے سرچشموں کے واحد مالک بن جاتے ہو اور جس مقصد کے لئے خدا نے انہیں پیدا کیا ہے، اسے نظرانداز کر دیتے ہو تو) کیا تم خدا کے قانونِ مکافات سے بالکل بے خوف ہو جاتے ہو؟ ذرا سوچو کہ اگر وہ ان معاشی سہولتوں کو ختم کر دے۔ زمین گرد و غبار (بنجر) بن کر رہ جائے۔ (۶۷/۱۶؛ ۶۷/۲۱؛ ۲۵/۳۰) یا خود تمہیں ایک زلزلہ کے جھٹکے سے زمین میں دھنسا دے، تو تم کیا کر لو؟

(۱۷) یا سوچو کہ اگر اوپر کے کسی کُرّے میں ایسا اختلال واقع ہو جائے کہ وہاں سے پتھر برسنے شروع ہو جائیں، تو تم اس تباہی سے کس طرح بچ سکو؟

اس وقت تم ان باتوں کو یونہی مذاق سمجھ رہے ہو لیکن تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ ہماری ان تنبیہات کا مطلب کیا تھا؟

(۱۸) تم سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح ہماری تنبیہات کو جھوٹا سمجھا تھا۔ سو تم تاریخ کے صفحات سے پوچھو کہ ان کی اس تکذیب کا نتیجہ کس طرح تباہی اور بربادی کی شکل میں سامنے آیا۔

(۱۹)۔ (تمہیں خدا کے کائناتی قانون کا اندازہ ہی نہیں کہ وہ کس قدر عظیم قوتوں کا مالک ہے۔ اس کے لئے بڑے وسیع علم اور تجربے کی ضرورت ہے لیکن اس کا سرسری سا اندازہ لگانا ہو تو) ذرا فضا کی پہنائیوں میں اُڑنے والے پرندوں کو دیکھو۔ (اتنے وزن کی چیز ہوا میں معلق نہیں ٹھہر سکتی لیکن وہ ہیں کہ) اس میں اس تیزی سے اُڑتے ہیں۔ سوچو کہ قانونِ خداوندی کے علاوہ کوئی اور شے بھی ایسی ہو سکتی ہے جو انہیں اس طرح فضا میں تھامے رکھے اور گرنے نہ دے؟ حقیقت یہ ہے کہ اُس کا قانونِ نشو و نما ہر شے کی ضروریات اور تقاضوں پر نگاہ رکھتا ہے۔

(۲۰) تم بتاؤ کہ اگر خدا کے قانون کی تکذیب اور مخالفت سے تم پر تباہی آ جائے، تو وہ کون سا لشکر ہے جو اس کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکیگا؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جو، قانونِ خداوندی سے اس طرح انکار کرتے اور سرکشی برتتے ہیں، دھوکے اور خود فریبی میں مبتلا ہیں۔

(۲۱) ان سے پوچھو کہ اگر خدا، زمین کی اس صلاحیت کو سلب کر لے جس کی رُو سے اس میں سے خوراک پیدا ہوتی ہے، تو وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے سکے،

لیکن ان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آسکتیں' اس لئے کہ یہ لوگ سرکشی اور نفرت کے جذبات کی طغیانیوں میں' مستاد موج' بہے چلے جارہے ہیں۔ (اور کسی بات کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان جذبات میں غرق نہ ہو)۔

(۲۲) ان سے پوچھو کہ جو شخص اوندھی ڈال کر' عقل و فکر سے کام لئے بغیر جذبات کی رَو میں بہے چلا جارہا ہو' وہ کبھی اُس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو زندگی کے توازن بردوش راستے پر سیدھا چل رہا ہو؟

(۲۳) ان سے کہو کہ خدا نے تمہیں پیدا کیا تھا تو جانوروں کی طرح نہیں بنا دیا تھا۔ اس نے تمہیں سننے' دیکھنے اور سمجھنے سوچنے کی استعداد دی تھی تاکہ تم اس سے کام لے کر انسانوں کی طرح زندگی بسر کرو۔ لیکن تم سوچو کہ ان قوتوں کو تم کس حد تک ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے ہو؟

(۲۴) اس خدا نے تمہیں زمین میں ہر طرف پھیلا دیا ہے (اور سامانِ معیشت فراوانی سے عطا کر دیا ہے۔ لیکن اس پھیلاؤ سے یہ مطلب نہیں کہ تم اُس کے قانون کے دائرے سے باہر نکل گئے ہو۔ بالکل نہیں) تم ہر طرف سے ہنکا کر اس کے قانونِ مکافات کی طرف لائے جارہے ہو۔ (تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ $\frac{۲۳}{۷۹}$)

(۲۵) (ان کے سامنے جب بھی قانونِ مکافات کا ذکر آتا ہے تو) یہ کہتے ہیں کہ اگر تم واقعی سچ کہتے ہو تو یہ بتاؤ کہ وہ تباہی جس سے تم ہمیں ڈراتے رہتے ہو' کب آئے گی؟

(۲۶) ان سے کہو کہ اس بات کا علم تو خدا ہی کو ہے کہ وہ تباہی کب آئے گی۔ میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ بڑا ہی تباہ کن ہوگا اور یہ تباہی آکے رہے گی۔

(۲۷) (اس وقت تو یہ اُس تباہی کے لئے اس طرح جلدی مچا رہے ہیں۔ لیکن) جب یہ اُسے اپنے قریب آتا دیکھیں گے' تو غم کے مارے ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔ اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ تباہی جسے تم آوازیں دے دے کر بلایا کرتے تھے۔

(۲۸) (تم ان سے کہو کہ اس سوال کو چھوڑو کہ میرا اور میرے ساتھیوں کا انجام کیا ہوگا؟ ہم تباہ ہو جائیں گے یا خدا کی رحمت اور ربوبیت ہمارے شاملِ حال رہے گی۔ تم یہ بتاؤ کہ جب تمہارے انکار اور سرکشی کی وجہ سے تم پر تباہی آئے گی تو تمہیں اس سے کون پناہ دیگا؟ (تم ہماری فکر چھوڑو' اپنا خیال کرو)

(۲۹) ان سے کہو کہ ہم جس خدا پر ایمان لائے ہیں وہ خدائے رحمٰن ہے۔ یعنی وہ جس نے کائنات کی نشو و نما کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اس کے قانونِ نشو و نما پر ہمارا پورا پورا بھروسہ ہے (اس لئے ہم پر کبھی تباہی

تباہی نہیں آسکتی)۔ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کون کھلی ہوئی گمراہی میں ہے (اور کون صحیح راستے پر چل رہا ہے)

(۳۰)۔ (بات چلی تھی اس سے کہ ہم نے جو رزق کے سرچشمے، تمام انسانوں کی نشو ونما کے لئے عطا کئے ہیں، انہیں اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر نہ بیٹھ جاؤ۔ اس سلسلہ میں انہیں آخر میں، پھر ایک بات سمجھاؤ) ان سے پوچھو کہ اس وقت، خدا کے قانونِ کائنات کے مطابق، پانی زمین سے اُبل کر چشموں کے ذریعے، اوپر کو آتا ہے۔ اگر اس کا قانون یہ ہو جائے کہ پانی، اوپر کی طرف آنے کے بجائے، زمین میں نیچے ہی نیچے چلا جائے تو بتاؤ کہ یہ آبِ رواں (جس پر تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے) تمہیں کون دے سکیگا؟

(سوچنے والے کے لئے اتنی سی بات ہی کافی ہے کہ رزق، خدا کی موہبت ہے، اس لئے اسے خدا ہی کے قانون کے مطابق، تقسیم ہونا چاہیئے)۔

سورۃ القلم (۶۸)

(۱) اے رسول! یہ مخالفین کہتے ہیں کہ تو دیوانہ ہے۔

ان سے کہو کہ ذرا دوات اور قلم[1] اور جو کچھ اس سے لکھا جاتا ہے (یعنی علم کی بارگاہ) سے پوچھو کہ کیا دیوانے اسی قسم کے ہوتے ہیں اور ایسی ہی تعلیم پیش کیا کرتے ہیں جیسی تو اس کتابِ عظیم میں پیش کر رہا ہے؟

(۲)-(۳)، تو خدا کے فضل و کرم سے بیش بہا نعمت (نبوت اور مملکت) سے نوازا گیا ہے۔ اس لئے تیری سعی و کاوش کا صلہ ایسا ملے گا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

(۴) اگر یہ لوگ ذرا عقل و ہوش سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ جس شخص کا مزاج اسقدر

---

[1] ن کے معنی تلوار بھی ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے "ن و القلم" سے مراد "شمشیر اور قرآن" بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی قانونِ خداوندی اور قوتِ نافذہ۔ یہی دو چیزیں ہیں جن سے اسلامی نظامِ مملکت قائم ہوتا ہے۔ قانونِ خداوندی مملکت کی قوت کی نگرانی کرنے والا کہ وہ بے جا صرف نہ کی جائے۔ اور قوت، قانونِ خداوندی کی نگرانی کرنے والی کہ وہ محض "وعظ" بن کر نہ رہ جائے۔

اعتدال پر ہو جس کی سیرت اس قدر بلند ہو، جو حسنِ اخلاق کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کر رہا ہو وہ کبھی دیوانہ نہیں ہو سکتا۔ (اور جب علم اور تلوار کے ساتھ حسنِ اخلاق بھی شامل ہو جاتے تو معاشرہ کا نقشہ کیا ہو جائیگا!)

(۵-۶) یہ تو رہی نظری شہادت۔ اس کی عملی شہادت کے لئے تھوڑا سا انتظار کرو۔ تمہارے قائم کردہ نظام کے درخشندہ نتائج خود بخود بتادیں گے کہ تم دونوں میں کون دیوانہ اور فریب خوردہ ہے!

(۷) اس لئے کہ تیرے خدا پر اچھی طرح روشن ہے کہ کون صحیح راستے پر چل رہا ہے اور کون اس راستے سے بھٹک چکا ہے۔ (دونوں کو دن بھر چلنے دو، شام کے وقت جب سفر ختم ہو جاتے گا تو واضح ہو جائیگا کہ کون منزل پر پہنچ گیا اور کون راستے میں کھو گیا۔)

(۸-۹) یہ لوگ ان حربوں پر اس لئے اتر آتے ہیں کہ یہ چاہتے ہیں کہ تو اس قسم کے طعن و تشنیع سے تنگ آکر مفاہمت پر آمادہ ہو جاتے۔ یعنی کچھ تو اپنے مقام سے ہٹے کچھ یہ نرم پڑیں، اور اس طرح تم دونوں میں مفاہمتؒ کی شکل پیدا ہو جاتے۔ لیکن تم ان کی بات بالکل نہ ماننا۔ (اس لئے کہ جو شخص حق پر ہو اس کے لئے اپنے مقام سے ذرا سا ہٹ جانا بھی اس کی شکست ہے۔ حق اپنے مقام سے ہٹا تو باطل ہو گیا۔ اس کے برعکس، باطل، کوئی بھی مقام اختیار کرلے، اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ پہلے بھی باطل تھا، پھر بھی باطل رہے گا۔ صحیح جواب ایک، اور صرف ایک ہوتا ہے۔ غلط، سینکڑوں ہو سکتے ہیں۔ $\frac{10}{15}$; $\frac{11}{112}$ ($\frac{2}{4}$)

(۱۰)۔ (اے رسول!) جماعتِ مخالفین کے اس نمائندہ کی (جو مفاہمت کی پیشکش لے کر آیا ہے) یہ حالت ہے کہ یہ بڑا دنی الطبع، پست ذہنیت کا مالک اور سخت جھوٹا ہے۔ اسی لئے اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لئے قسموں پر قسمیں کھاتے چلا جاتا ہے۔

(۱۱) یہ چاہتا ہے کہ اپنی دسیسہ کاریوں سے تمہاری جماعت میں تفرقہ پیدا کر دے۔ اس کی نگاہ کا زاویہ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ اسے کہیں بھی حسن اور خیر نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ شر، نقص، اور خرابی دکھائی دیتی ہے۔ ہر وقت لگائی بجھائی میں مصروف رہتا ہے۔ اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر کرتا پھرتا ہے اور اپنی باتوں میں جھوٹ سچ ملا کر، ہر جگہ فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

(۱۲) خود بھی کوئی بھلے کا کام نہیں کرتا اور لوگوں کو بھی بھلائی کے کاموں سے روکتا رہتا ہے انسانیت کے صحیح قانونِ حیات سے سرکشی برتنے میں سب سے آگے اور منفعت بخش تعمیری کاموں میں سب سے پیچھے رہتا ہے۔

(۱۳) بیحد بے رحم، بے درد، سخت گیر، جھگڑالو، ہر وقت نیت یہ کہ لوگوں کا سب کچھ سمیٹ کر

ؒ COMPROMISE.

ہڑپ کر جاتے۔ یہ زندگی کی سرسبزی اور شادابی سے یکسر محروم ہے' اس لئے بڑا ہی ذلیل اور کمینہ ہے۔

(۱۴) یہ اس قسم کی سیرت و کردار کے باوجود' ان لوگوں کا لیڈر اس لئے بنا ہوا ہے کہ یہ سرمایہ دار ہے' اور اس کے قبیلے (افراد خاندان) کا جتھہ بہت بڑا ہے۔

(۱۵) دولت اور قوت کا یہی نشہ ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب اس کے سامنے ہمارے قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو یہ نہایت نفرت و حقارت اور غرور و تکبر سے کہتا ہے کہ یہ سب پہلے لوگوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔ یہ محض افسانے ہیں۔

(۱۶) تم عنقریب دیکھو گے کہ اس کا یہ زعم باطل کس طرح ٹوٹتا ہے' اور یہ جو اتنی بڑی "ناک" لئے پھرتا ہے' وہ کس طرح بیچ چوراہے کے کٹتی ہے۔

(۱۷) ہم اسے ایسا پلٹا دیں گے جیسا (مشہور مثال ہے) باغ والوں کو پلٹا دیا تھا[1]۔ ان کا بہت بڑا باغ تھا جس کے درخت پھلوں سے لدے ہوتے تھے۔ انہوں نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ ہم صبح ہوتے ہی ان کا پھل توڑ لیں گے۔

(۱۸) انہوں نے اس میں سے محتاجوں اور مسکینوں کے لئے ذرا سا حصہ بھی الگ کرنے کا ارادہ نہ کیا تھا۔

(۱۹) تو ہوا یہ کہ وہ ابھی سو ہی رہے تھے کہ ایک ایسی بلائے ناگہانی (مثلاً ٹڈی دل) آئی کہ وہ ساری فصل چٹ کر گئی۔

(۲۰) اور وہاں سرسبز و شاداب باغ کی جگہ چٹیل میدان رہ گیا۔

(۲۱-۲۲) صبح اٹھ کر انہوں نے ایک دوسرے کو آواز دی کہ اٹھو، چلو، سویرے سویرے پھل توڑ کر فارغ ہو جائیں۔

(۲۳-۲۴) چنانچہ وہ اس مقصد کے لئے اپنے گھروں سے روانہ ہو گئے۔ وہ چلتے جاتے تھے اور آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے تھے کہ دیکھنا! آج کوئی محتاج اور مسکین تمہارے پاس پھٹکنے نہ پائے۔

(۲۵) چنانچہ وہ اس طرح باغ کے قریب پہنچ گئے اور انہوں نے ایسا انتظام کر لیا کہ کوئی محتاج وہاں تک نہ آنے پائے۔

(۲۶) جب وہ وہاں پہنچے تو (باغ اور کھیتوں کو دیکھ کر) کہنے لگے کہ ہم آج کہیں راستہ تو نہیں بھول گئے؟ یہ تو ہمارے باغات اور کھیت معلوم ہی نہیں ہوتے۔

---

[1] اسی قسم کی مثال (۱۸ / ۳۲-۳۳) میں بھی آئی ہے۔

(۲۶)۔ پھر جب ذرا آنکھیں مل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے ہی باغات اور کھیتوں کے کنارے کھڑے ہیں۔ اس پر، وہ سر پیٹ کر بیٹھ گئے اور چلا اٹھے کہ ہائے ہم مارے گئے۔ ہمارا سب کچھ لٹ گیا۔ ہم تباہ و برباد ہو گئے، ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

(۲۸) ان میں' ایک شخص نے' جس نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا' کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم اپنی تمام جدوجہد کو خدا کے قانون کے تابع رکھو۔ تم نے میری بات نہ مانی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

(۲۹) انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے مسکینوں اور غریبوں کے حقوق کا قطعاً خیال نہیں رکھا تھا۔ یہ ظلم تھا اور ظلم کا نتیجہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ورنہ خدا کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی کی محنت کو یونہی ضائع کر دے۔

(۳۱-۳۰) پھر وہ ایک دوسرے کو لگے لعنت ملامت کرنے کہ تم نے ہی ایسی پٹی پڑھائی تھی جس سے ہم قانونِ خداوندی سے سرکش ہو گئے۔

(۳۲) اب ہم قانونِ خداوندی کی طرف پھر رجوع کرتے ہیں۔ امید ہے کہ خدا ہمیں اس سے بہتر سامانِ رزق عطا کرے گا۔

(۳۳) اے رسولؐ! تم ان مخالفت کرنے والوں کو بتا دو کہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے والوں پر اس طرح اس دنیا میں تباہی آیا کرتی ہے۔ اور آخرت کی تباہی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہو گی۔ اے کاش! یہ اس بات کو سمجھ لیتے۔

(۳۴) اس کے برعکس' جو لوگ ہمارے قانونِ ربوبیت کی نگہداشت کرتے ہیں (اور اپنی کمائی میں محتاجوں اور مسکینوں کا حق سب سے پہلے سمجھتے ہیں)' انہیں ایسی جنتی زندگی نصیب ہو گی جس میں ہر قسم کی آسائشیں ہوں گی۔

(۳۵) یہ اس لئے کہ' یہ ہو نہیں سکتا کہ جو لوگ ہمارے قوانین کی اطاعت کریں' وہ ان لوگوں جیسے ہو جائیں جو ان سے سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ (جب ان کے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو ان کی منزل واحد کیسے ہو سکتی ہے؟)

(۳۶)۔ (یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو جی میں آئے کرتے رہیں' ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں)۔ ان سے کہو کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے جو تم اس قسم کے فیصلے کرتے ہو؟

(۳۸-۳۷) کیا تمہارے پاس کوئی ایسا نوشتۂ خداوندی ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ تم جو جی

چاہے اختیار کرلو، نتائج تمہارے حسب پسند نکلتے آئیں گے۔

(۳۹) یا تم نے خدا سے اس قسم کا کوئی عہد لے رکھا ہے کہ تم زندگی کے معاملات کے متعلق جس قسم کے فیصلے تمہارا جی چاہے کرتے جاؤ، تمہیں ہر حال میں فائدہ ہی فائدہ ہوگا — چت بھی تمہاری ہوگی اور پٹ بھی تمہاری — اور پھر خدا نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ وہ قیامت تک اپنے اس عہد کو پورا کرتا رہے گا!

(۴۰) ان سے پوچھو کہ تم میں وہ کون ہے جو چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہے کہ میں نے خدا سے اس قسم کا عہد لے رکھا ہے اور اس کے پورا کرانے کا میں ذمہ دار ہوں۔

(۴۱) یا اس معاملہ میں ان کے کوئی اور شریک ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان سے کہو کہ وہ ان شرکاء کو سامنے لائیں اور اس طرح اپنے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت دیں۔

(۴۲) - یہ سب ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات اٹل ہے۔ اس قانون کی رو سے — گندم از گندم بروید جو ز جو — لہٰذا، اب وہ وقت بہت قریب آرہا ہے جب ان کی اس غلط روش کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آجائیں گے۔ بڑے گھمسان کا رن پڑے گا۔ چاروں طرف سے شدت کی سختیاں امنڈ کر آجائیں گی۔ اس وقت، ان میں سے بعض انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جائیں، لیکن اس کا وقت گزر چکا ہوگا۔ اس وقت یہ بات ان کے بس کی نہیں رہے گی کہ کسی طرح اس تباہی سے بچ جائیں۔ (ظہورِ نتائج کے وقت مہلت کا عرصہ ختم ہو جاتا ہے)

(۴۳) اس وقت ذلت سے ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، اور رسوائی کی سیاہی ان کے چہروں پر ملی ہوگی۔ اس سے پہلے مہلت کے عرصے کے دوران، انہیں کہا جاتا تھا کہ وہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جائیں۔ اس وقت یہ بات ان کے بس میں تھی کہ اپنے آپ کو اس تباہی سے بچا لیتے۔ لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اب یہ تباہی سے نہیں بچ سکتے۔

(۴۴) (سو اے رسولؐ! تم اپنے پروگرام کی تکمیل میں مصروفِ عمل رہو) اور ان لوگوں کو جو ہمارے قانونِ مکافات کی صداقت کو جھٹلاتے ہیں، ہمارے حوالے کر دو۔ ہم انہیں، بتدریج، آہستہ آہستہ، تباہی کی طرف لا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ انہیں اس مقام تک پہنچا دیں گے جہاں انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ وہ تباہی آ کہاں سے رہی ہے۔

(۴۵) ہم انہیں اس وقت مہلت دے رہے ہیں۔ ہماری تدبیر بڑی محکم اور مضبوط ہوتی ہے اس لئے یہ اس کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔

(۴۶) ذرا سوچو کہ یہ جو تجھ سے اس طرح گھبرا کر بھاگ جانا چاہتے ہیں، تو کیا تو ان سے، کچھ معاوضہ

مانگ رہا ہے جسے یہ اپنے لئے ناقابلِ برداشت جرمانہ سمجھ رہے ہیں؟ (۵۲/۴۰)

(۴۷) یا انہیں غیب سے پتہ چل گیا ہے (کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ کبھی واقع نہیں ہوگا) اور انہوں نے اس غیب کو لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ (اور اس لئے ان کی جرأتیں بیباک ہو رہی ہیں)

(۴۸) تو ان کی کسی بات کی پرواہ نہ کر اور اپنے نشو و نما دینے والے کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل میں ثابت قدم رہ۔ اور مچھلی والے پیغمبر (یونسؑ) کی طرح جلدبازی نہ کر۔ (وہ اپنی قوم کی مخالفت سے گھبرا کر وقت سے پہلے، ان سے ہجرت کر کے چلا گیا تھا۔ (۲۱/۸۷ ؛ ۳۷/۱۳۹) اس سے وہ خود مشکل میں پھنس گیا، اور غم و الم کی اس حالت میں اس نے ہمیں مضطربانہ پکارا۔

(۴۹) اگر اسے، اس کے نشو و نما دینے والے کی طرف سے آسائش کا سامان میسر نہ آجاتا، تو وہ لبِ ساحل، چٹیل میدان میں پڑا رہ جاتا اور اس کی حالت بڑی خراب ہو جاتی۔ وہ وہاں سے نکل ہی نہ سکتا۔ (۳۷/۱۴۵)

(۵۰) (لیکن یہ ایک عارضی مصیبت تھی جو اس پر، اس کی اجتہادی غلطی کی وجہ سے آگئی۔ ورنہ) وہ خدا کے برگزیدہ اور صالح بندوں میں سے تھا۔ اور خدا کی نظروں میں ویسا ہی رہا۔ (لہٰذا تم، اے رسولؐ! جلدبازی نہ کرنا، استقامت سے اپنے پروگرام پر جمے رہنا اور اس کے مطابق ہر قدم اٹھانا۔ اس سے تم ہر خطرہ سے محفوظ رہو گے۔)

(۵۱) ان کفار کی کوشش یہ رہتی ہے کہ جب وہ تم سے قرآن سنیں تو تمہیں (کبھی) دیوانہ کہہ دیں، (اور کبھی ساحر اور شاعر) اور تمہاری طرف گھور گھور کر دیکھیں، تاکہ تم ان سے زچ پڑ جاؤ، اور اس طرح اپنے مقام سے پھسل جاؤ۔

(۵۲) ولیکن تم اس سے مت گھبراؤ۔ اگر تمہاری یہ قوم، اس ضابطۂ زندگی کو اختیار نہیں کرتی، تو نہ کرے، یہ صرف اسی قوم کے لئے نہیں آیا۔ یہ تو تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ یہ قوم اسے تسلیم نہیں کرے گی تو کوئی اور قوم تسلیم کرے گی اور اس سے صاحبِ شرف و مجد ہو جائے گی۔ تکریمِ انسانیت اسی ضابطۂ حیات سے وابستہ ہونے سے حاصل ہوگی۔ جو قوم بھی چاہے، اسے حاصل کر لے۔

سورۃ الحاقۃ (۶۹)

(۱) ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آجانے والی تباہی۔

(۲۔۳) یہ تباہی کیا ہے ؟ اس کے متعلق بجز خدا سے بہتر سمجھانے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ یہ واقع ہو کر رہنے والی تباہی کیا ہے، اور وہ کیوں آئیگی۔)

(۴) یہ اسی قسم کی تباہی ہے جو ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے، اقوامِ سابقہ پر بھی آتی رہی۔ مثلاً عادؔ اور ثمودؔ کو تنبیہ کی گئی کہ اگر وہ اپنی غلط روش سے باز نہیں آئینگے تو ان پر کھڑکھڑا دینے والی تباہی آ جائیگی۔ انہوں نے اس تنذیر کو جھٹلایا، تو اس کا نتیجہ کیا نکلا ؟

(۵) شدید کڑک کے ساتھ ایک ہیبت ناک زلزلہ آیا جس نے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا۔

(۶) اور عادؔ کو بے پناہ آندھی کے جھکڑ نے ختم کر دیا۔

(۷) وہ آندھی، ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی۔ اس نے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ تو اگر وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ وہ کس طرح مُردوں کی طرح گرے پڑے ہیں۔ یوں، جیسے کھجور کے تناور درخت جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دیئے گئے ہوں۔ (۵۴/۲۰)

(۸) کیا تو ان میں سے کسی کو بھی باقی دیکھتا ہے ؟ وہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو گئے۔

(۹) اسی طرح فرعون کا بھی حشر ہوا، اور اُن دیگر اقوام کا بھی، جو اس سے پہلے ہو گزری ہیں۔ اور (قومِ لوط کے) خطاکاروں کا، جن کی بستیاں الٹ گئیں تھیں۔

(۱۰) انہوں نے اپنے نشو و نما دینے والے خدا کے رسولوں کی نافرمانی کی تو اس کے قانونِ مکافات نے انہیں سختی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

(۱۱)۔ (رسولوں کی معصیت کرنے والے تو اس طرح تباہ و برباد ہو گئے لیکن جن لوگوں نے اُن رسولوں کا ساتھ دیا، انہیں ہم نے تباہیوں سے محفوظ رکھا۔ مثلاً جب طوفانِ نوح کے وقت، پانی کی طغیانیاں حد سے بڑھ گئیں تو ہم نے (اے جماعتِ مومنین!) ان لوگوں کو جو تمہارے جیسا مسلک رکھتے تھے، کشتی میں سوار کرا لیا۔

(۱۲)۔ (ہم نے اقوامِ سابقہ کے یہ واقعات اس لئے بیان کئے ہیں) کہ یہ تمہارے لئے قانونِ مکافات کی تاریخی شہادتوں کا کام دیں۔ اور گوشِ نصیحت نیوش (معقول بات سننے والے) انہیں اچھی طرح سے یاد رکھیں۔ (۱۲/۲۹ ؛ ۹/۱۹ ؛ ۵۴/۲۰)

اسی طرح کی تباہی اِن مخالفین پر بھی آنے والی ہے۔

(۱۳۔۱۴) جب اعلانِ جنگ کا بگل پہلی بار بجایا جائے گا، اور بڑے بڑے لیڈر، اور ان کا لاؤ لشکر سب تباہ کر دیئے جائیں گے۔ اور ایک ہی حملہ میں (سردارانِ قوم) کی سرکشی اور تکبر کا بھُرکس نکال کر

رکھ دیا جائے گا۔

(۱۵) اُس دن یہ آنے والی تباہی آ جائے گی۔

(۱۶) اُس وقت ہر سربلند متکبر کی قوت پاش پاش ہو جائے گی، اور ہر مستبد کی گرفت ڈھیلی پڑ جائیگی۔

(۱۷) اور کائناتی قوتیں اسے ہر طرف سے گھیرے ہوں گی، اور خدا کے نظامِ ربوبیت کا مرکزی کنٹرول آٹھ شعبوں میں بٹا ہو گا۔[1]

(۱۸) اُس دن تم سب نکھر کر سامنے آ جاؤ گے۔ تمام راز فاش ہو جائیں گے۔ اور تمہاری کوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔

(۱۹) سو جس کے اعمال کا رجسٹر یمن و سعادت کے ہاتھوں میں ہو گا، وہ ہر ایک سے خوشی خوشی کہے گا کہ لو! میرا نامۂ اعمال پڑھو۔

(۲۰) (وہ یہ بھی کہے گا کہ) میں نے اس کا خیال رکھا تھا کہ جو کچھ میں کرتا ہوں، اس کا حساب ضرور ہو گا۔ (اس احتیاط کا نتیجہ تھا کہ میں غلط روش سے بچتا رہا۔)

(۲۱) سو اس کی زندگی من مانی خوشگواریوں کی ہو گی۔

(۲۲-۲۳) ایک بلند طبق معاشرہ میں، جس کے پھل ہر وقت اُن لوگوں کی دسترس میں ہونگے۔

(۲۴) اُن سے کہا جائے گا کہ تم نہایت اطمینان سے کھاؤ پیو۔ یہ سب ان اعمال کا نتیجہ ہے جو تم نے سابقہ ایام میں کئے تھے۔

(۲۵) لیکن جس کا اعمالنامہ، نامساعدت (کے بائیں ہاتھ) میں دیا جائے گا، وہ (بصد حسرت و یاس) کہیگا کہ اے کاش! مجھے یہ رجسٹر نہ دیا جاتا۔

(۲۶) اور نہ ہی مجھے معلوم ہوتا کہ میرے اعمال کا حساب کیا ہے۔

---

[1] ان تمام آیات میں، الفاظ کے مجازی معنی لے کر انہیں اُس تباہی پر منطبق کیا گیا ہے جو مخالفین قریش پر جماعتِ مومنین کے ہاتھوں آئی تھی۔ یہ اس لئے کہ اس سے پہلے جن اقوامِ سابقہ کا ذکر کیا گیا ہے ان سب پر تباہی اسی دنیا میں آئی تھی۔ (لہٰذا، ان آیات میں، قریش کی بھی اسی تباہی کا ذکر ہونا چاہیئے جو ان پر اسی دنیا میں آئی تھی) لیکن اگر ان الفاظ کے حقیقی معانی لئے جائیں تو ان آیات میں کسی ایسے کائناتی انقلاب کا ذکر ہے جسے ہم اس وقت نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی شکل کیا ہو گی۔ قرآن کریم کی ان آخری سورتوں میں، یہ صورت اکثر و بیشتر سامنے آئے گی۔ ان میں الفاظ کے حقیقی معانی کے لئے آپ قرآن کریم کا کوئی سا ترجمہ دیکھ لیں (یا لغات القرآن)

(۲۷) اے کاش! کسی طرح موت میرا قصہ تمام کر دیتی۔

(۲۸) افسوس کہ وہ مال (جس پر میں اس قدر اتراتا تھا) میرے کسی کام نہ آیا۔

(۲۹) اور میرا وہ غلبہ اور امارت (جس کے بل بوتے پر میں نے اس قدر سرکشی اختیار کر رکھی تھی)، مجھ سے جاتا رہا۔

(۳۰) کہا جائیگا کہ اسے پکڑو اور اس کی گردن میں طوق ڈالو۔

(۳۱) پھر اسے دوزخ میں ڈال دو۔

(۳۲) اور وہاں اسے ایک لمبی زنجیر سے جکڑ دو۔

(۳۳) یہ وہ ہے جو خدائے عظیم کے قانونِ مکافات پر یقین نہیں رکھتا تھا۔

(۳۴) اور اسی لئے، اس کی کیفیت یہ تھی کہ یہ لوگوں کو اس کی ترغیب نہیں دیتا تھا کہ ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں ہر اس شخص کو سامانِ رزق ملتا رہے جس میں کمانے کی سکت نہ رہی ہو۔

(۳۵)۔ (اس کی یہ کیفیت اس لئے تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ میرے پاس اس قدر مال و دولت ہے کہ مجھے کسی کی محتاجی نہیں ہوگی۔ اس لئے مجھے کسی ایسے نظام کی کیا ضرورت ہے جس میں ہر شخص دوسرے کا رفیق و دمساز ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت وہ خود دیکھ لے گا کہ انسان کو رفیق و غمخوار دوست کی کتنی ضرورت ہوتی ہے لیکن) اس وقت اس کا کوئی دوست اور غمخوار نہیں ہوگا۔

(۳۶) اور کھولتے ہوئے پانی کے سوا (جس سے پیاس اور بھڑک اٹھے) کچھ پینے کو نہیں ملے گا۔ یہ اس کے اپنے ہی آنسوؤں کے گھونٹ ہوں گے۔

(۳۷) یہ غذا صرف خطاکاروں کی ہوتی ہے۔

(۳۸۔۳۹)۔ (اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے، قیاسات نہیں۔ یہ اٹل حقائق ہیں جن پر) وہ واقعات جو محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ چکے ہیں، اور وہ جو ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں، شاہد ہیں۔

(۴۰) ان باتوں کا کہنے والا (جس کی زبان سے یہ تم تک پہنچ رہی ہیں) ہمارا معزز پیغامبر ہے۔

(۴۱-۴۲) یہ کسی شاعر کے تخیلات نہیں، نہ ہی کسی کاہن کے قیاسات ہیں۔ (یہ خدا کی وحی ہے۔) لیکن بہت تھوڑے ہیں جو عقل و بصیرت سے کام لے کر ان حقائق پر غور کریں اور اس طرح ان کی صداقت پر ایمان لے آئیں۔ اور انہیں بطور ضابطۂ حیات اپنے سامنے رکھیں۔

(۴۳) یہ اُس خدا کی طرف سے بھیجا ہوا قرآن ہے جو تمام اقوامِ عالم کا نشوونما دینے والا ہے (اور اس

سے مقصد یہ ہے کہ لوگ ان قوانین کا اتباع کریں تاکہ ان کی ذات کی نشوونما ہو جائے)

(۴۴ - ۴۶) اس وحیٔ خداوندی میں انسانی خیالات کی ذرہ برابر آمیزش نہیں۔ اگر یہ رسول اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر اسے ہماری طرف منسوب کرتا تو ہم اسے دائیں ہاتھ کی محکم گرفت سے پکڑتے۔ اس کے پروگرام کو کبھی آگے نہ بڑھنے دیتے اور اس کے ثبات و استحکام کی قوتوں کو بے کار کر کے رکھ دیتے۔ اس کی اسکیموں کو بے جان کر دیتے۔

(۴۷) اور تم میں سے کوئی ایسا نہ ہوتا جو ہمیں ایسا کرنے سے روک سکتا۔ (باطل پر مبنی پروگرام آخرالامر ناکام ہو کر رہتا ہے)

(۴۸) سو اس قدر واضح حقائق کے بعد بھی تم لوگ ان قوانین کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ اس لئے کہ) ان باتوں سے وہی لوگ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں جو زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں۔

(۴۹) اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں (جہاں ایسے لوگ ہیں جو غور و فکر کے بعد اس قرآن پر ایمان لے آئیں، وہاں) ایسے بھی ہیں جو اسے جھٹلائیں گے۔

(۵۰) (لیکن تمہارے جھٹلانے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ آنے والا انقلاب آکر رہے گا) اور جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں، وہ ان کے دلوں میں سوزِ حسرت بن کر انہیں جلاتا رہے گا۔

(۵۱) یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے، جو سامنے آکر رہے گی۔ یہ بالکل یقینی چیز ہے، ظن و قیاس نہیں — یہ الحاقتہ ہے۔

(۵۲) اس لئے (اے رسول! تم ان لوگوں کی اس قسم کی باتوں کی پرواہ نہ کرو۔ اور) اپنے خدا کی ربوبیت عظمیٰ کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے سرگرمِ عمل رہو۔ (اس کے نتائج بتا دیں گے کہ تمہارا ہر دعویٰ کس طرح حقیقت پر مبنی ہے۔)

ادارہ طلوعِ اسلام کی حیات افروز پیشکش

پاکستان کا معمار اوّل

سرسید کی صحیح عظمت اور ہماری سیاسی زندگی میں اس کا بلند مقام ابھی پہلے سامنے نہیں آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتا تو پاکستان بھی وجود میں نہ آتا۔ اس مختصر لیکن نہایت جامع کتاب میں سرسید کا صحیح مقام نہایت دلکش انداز میں سامنے لایا گیا ہے

قیمت صرف تین روپے

قرآنی قوانین

ایک نہایت جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ وکلا حضرات اور جج صاحبان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوگی۔ اس میں ان تمام احکام کو مرتب کر دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں بطور قوانین دیئے گئے ہیں علاوہ ازیں ان مستقل اقدار کو بھی مدون کر دیا گیا ہے جن کی روشنی میں امت معاشرے کے تقاضوں کے مطابق خود جزئی قوانین مرتب کرے گی

قیمت صرف تین روپے

جہاد

اسلام کے اس بنیادی اصول کے متعلق حقیقت کشا بحث۔ اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کا مدلل جواب۔ ایک مختصر لیکن جامع تصنیف۔ بصیرت افروز حیات آور۔ قیمت صرف۔ دو روپے

عربی خود سیکھیے

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا۔ اس کے جدید ایڈیشن میں قریب ایک سو صفحات پر مشتمل ایسے گوشواروں کا اضافہ کر دیا گیا ہے جن میں ساری عربی گرامر سمٹ کر آ گئی ہے۔ قیمت صرف ساڑھے چار روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بیان دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد۔ پہلی جلد آٹھ روپے دوسری اور تیسری جلد (بعد روپے فی جلد)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے مفکروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ ستاون روپے۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ۔ آٹھ روپے سستا ایڈیشن۔ چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناشر ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵ بی گلبرگ ۔ لاہور

اسلام اور سرمایہ

ایک بصیرت افروز اور معلومات افزا پیشکش

- کیا اسلام، مغرب کے معاشی نظام کا حامی ہے ______ ؟
- کیا اسلام، اشتراکی نظام کا حامی ہے ______ ؟
- کیا اسلام کا کوئی اپنا معاشی نظام ہے ______ ؟
- اس نظام کی تفاصیل کیا ہیں ______ ؟
- وہ کس طرح دوسرے معاشی نظاموں سے مختلف ہے ______ ؟
- کیا وہ نظام، نوع انسان کے معاشی مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکتا ہے ______ ؟
- اس نظام کی مخالفت کس طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے، اور کیوں ؟

یہ، اور اسی قسم کے دیگر معاشی مسائل کا تجزیہ، تبصرہ اور حل۔ عصر حاضر کے پریشاں انسان کے لئے شارع امید۔ اہل پاکستان کیلئے قندیل راہ۔

قسم اعلیٰ ــ سفید پرنٹنگ پیپر۔ نہایت روشن طباعت۔ مضبوط جلد۔ حسین گردپوش۔
قیمت ــ نو روپے

سستا ایڈیشن ــ نیوز پرنٹ۔ بکس بورڈ کور ــ قیمت ــ پانچ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور